جون ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق
- مسئلہ سندھ کا حل: کیا اور کیسے
- "گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

تازہ، خالص اور توانائی سے بھرپور

پاک پیور®

مکھن اور دیسی گھی

یونائیٹڈ ڈیری فارمز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
(قائم شدہ ۱۸۸۰) لاہور
۲۲- لیاقت علی پارک ۴- بیڈن روڈ- لاہور، پاکستان
فون: ۲۲۱۵۹۸-۳۱۲۷۵۴

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (قرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۶
شمارہ ۶
شوال المکرم ۱۴۰۷ھ
جون ۱۹۸۷ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مینجنگ ایڈیٹر
اقتدار احمد

ادارۂ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی
حافظ عاکف سعید
مقبول الرحیم مفتی

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحہ، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا ۱۵/- روپے پاکستانی
ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر — ۶ امریکی ڈالر یا ۱۰۰/- روپے پاکستانی
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ امریکی ڈالر یا ۱۵۰/-
شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ امریکی ڈالر یا ۲۰۰/-

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور نیشنل بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ تنظیم اسلامی
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۲۶۸۳-۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی فون ۲۱۶۵۸۶

طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح، لاہور

مشمولات

عرضِ احوال ——— ۳
اقتدار احمد

الہُدیٰ (نشست ۴۲) ——— ۱۱
بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال
ڈاکٹر اسرار احمد

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار ۲۱
سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد

مسئلۂ سندھ کا حل: کیا اور کیسے؟ ——— ۴۱
ا۔ پاکستانی سیاست اور مسئلہ سندھ — عبدالکریم عابد
ب۔ مسئلہ سندھ، ایک تجزیاتی مطالعہ — محمد موسیٰ بھٹو
ج۔ تاریخِ سندھ پر طائرانہ نظر — سید غلام مصطفےٰ شاہ
د۔ ایک وضاحت — ڈاکٹر عبدالخالق
ھ۔ پنجاب کی فریاد — محمد حنیف سلیمی

"گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے" — ۶۵
ا۔ مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل مرحوم — مولانا سعید الرحمٰن علوی
ب۔ شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہر پنج پیری — ملک وارث خان
ج۔ منصور احمد بٹلا مرحوم — شیخ جمیل الرحمٰن

رفتارِ کار ——— ۷۷
صوبۂ سرحد میں امیر تنظیم اسلامی کی دعوتی مصروفیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرض احوال

پچھلے ماہ عرض احوال کے زیریں حاشیئے میں معذرت کے ساتھ قارئین "میثاق" کو بتایا گیا تھا کہ انتخابی فہرستوں میں کاتب حضرات کی شدید اور پر از منفعت مصروفیت کے باعث نہ صرف پرچہ دیر سے تیار ہوا بلکہ رنگ برنگی کتابتوں کا مرقع بھی بنا ہے۔ چند مضامین جدید کمپوزنگ سسٹم یعنی نستعلیق بذریعہ کمپیوٹر، میں بھی تیار ہوئے۔ اس مشینی کتابت سے ہمیں پہلی بار واسطہ پڑا تھا لہٰذا ہمارے اناڑی پن نے بھی خاصے گل کھلائے۔ تاہم یہ ضرور ہوا کہ اس جدت کی خوبیاں ہم پر آشکار ہوئیں اور محسوس کیا گیا کہ اگر اسی کو پورے طور پر اختیار کیا جائے تو اولاً پرچے کے حسن صورت میں نمایاں اضافہ ہو گا اور ثانیاً پہلے سے کہیں زیادہ مواد پڑھنے والوں کو ضخامت کم کر کے بھی پہنچایا جا سکے گا۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اس بار پچھلے شمارے کے مقابلے میں زیادہ مضامین مشینی کتابت میں آئے ہیں اور انشاء اللہ اگلا پرچہ از اول تا آخر اسی انداز میں ہو گا جس کا بشری اندازوں کے مطابق نہایت قابل اعتماد انتظام کر لیا گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ یہ وضاحت بھی کر ہی دینی چاہئے کہ "میثاق" کی ضخامت کم کرنے سے جو بچت ہمیں کاغذ اور طباعت وغیرہ کے اخراجات میں ہو گی، اس سے دو چند اضافی لاگت مشینی کتابت پر آتی ہے۔

رہا تاخیر کا مسئلہ تو اس باب میں ایک بار پھر ہمیں معذرت ہی طلب کرنی پڑ رہی ہے۔ ماہ رمضان المبارک میں زندگی کے معمولات مسلمان معاشرے میں ایک حد تک تو ہر جگہ ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن ہمارے ادارے اور اس کے محل وقوع ..... یعنی قرآن اکیڈمی ..... میں یہ اثرات زیادہ ہی محسوس کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خصوصی توفیق اور قرآن مجید سے قلبی و عملی تعلق کی بدولت یہاں گذشتہ کئی سال سے اس مبارک مہینے کی راتیں "حبل اللہ المتین" کے ساتھ بسر کی جاتی ہیں۔ ہمارے قارئین کی اکثریت اس معمول سے اب تک واقف ہو چکی ہو گی جس کی ابتداء کی سعادت برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو حاصل ہوئی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

انہوں نے چار سال پہلے قرآن اکیڈمی کی مسجد میں ہمت کر کے "صوم رمضان" کی طرح "قیام رمضان" کو بھی اس کی حقیقی اور مطلوب شکل دینے کا بیڑا اٹھایا۔ عشاء کی نماز کو دوسری مساجد کے وقت سے تھوڑا سا موخر کیا جاتا اور پھر شب بھر میں بیس تراویح یوں پوری کی جاتی تھیں کہ وہ ہر چار رکعت سے پہلے ان میں پڑھے جانے والے جزو قرآن کا ترجمہ مع ضروری تشریح بیان کرتے اور ہر سورہ مبارکہ

کے آغاز سے قبل اس کا مجموعی تاثر مضامین کا خلاصہ اور عمود بھی بتاتے تھے۔ حاصل اس کا یہ ہوتا کہ پھر جب بندے رب کے روبرو دست بستہ کھڑے ہو کر خوش الحان حافظ سے قرآن مجید کا وہی حصہ سنتے تو "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم" والی بات نہ ہوتی بلکہ لطف حضوری حاصل ہوتا تھا۔ جوں جوں رات بھیگتی توں توں حافظ محمد رفیق صاحب کی سریلی آواز میں سوز بڑھتا اور مقتدیوں کو تنزیل کا وہ کیف ملتا جس کی ضرورت علامہ اقبال مرحوم نے یوں بیان فرمائی تھی۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اس نماز تراویح سے فارغ ہو کر نمازیوں کو سحری کھانے کے لئے گھروں کی طرف باقاعدہ دوڑ لگانی پڑتی اس لئے کہ وقت بہت ہی تنگ رہ جاتا تھا۔ اندازہ لگایا گیا تھا اور ہر طرف سے اس اندازے کی توثیق ہی ہوئی کہ رمضان المبارک کی راتوں میں اس نہج پر قرآن مجید کا "ختم" کم از کم زمانہ قریب کی معلوم و مشہور تاریخ میں پہلی بار ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے موسم کے شدائد' دور جدید کی آسائشوں..... از قسم ایئر کنڈیشننگ وغیرہ..... سے رضاکارانہ محرومی اور ناقابل اعتماد جسمانی صحت کے باوجود یہ کارنامہ محض اپنے خلوص و اخلاص کے بل پر' پیغام ربانی کو لوگوں کے سینوں میں اتارنے کی دھن میں اور اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم کی بدولت انجام دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں قرآن کے اعجاز' ڈاکٹر صاحب موصوف کے بیان اور اللہ تعالیٰ کے صفت رحمانیہ کا مظاہرہ سینکڑوں مستقل شرکاء نے بہ چشم سر دیکھا۔ کتنا مستند ہے رب کریم کا یہ فرمان

الرحمن ○ علم القرآن ○ خلق الانسان ○ علمه البيان ○

ڈاکٹر صاحب کا یہ لگ بھگ ایک سو گھنٹوں پر مشتمل بیان ریکارڈ ہوا اور اس کے آڈیو ٹیپ دنیا کے کونے کونے میں پہنچے ہیں۔ اگلے سال پھر قرآن اکیڈمی کی مسجد ہی کو یہ شرف دوبارہ حاصل ہوا لیکن بعد ازاں یعنی پچھلے رمضان المبارک ڈاکٹر صاحب کراچی کے احباب کے اصرار کو رد نہ کر سکے اور وہاں ناظم آباد کی ایک بڑی مسجد میں ان کا یہ ماہ مبارک اسی ڈھنگ سے گذرا' البتہ اب کی بار نہ ان کی صحت اس مشقت کی متحمل تھی اور نہ وہ پورے مہینے ملک میں قیام کا ارادہ رکھتے تھے۔ تاہم الحمدللہ کہ اللہ کے اس بندے کا لگایا ہوا یہ شجر طیبہ برگ و بار لا رہا ہے۔ پچھلے سال ان کے قیام کراچی کے دوران لاہور میں ان کے رفقاء اور خوشہ چینوں نے دو جگہ اس رسم کو نبھایا تھا۔ اس بار تین مقامات پر یہ رونق لگی اور ساتھیوں کا عزم ہے کہ اگلے برس انشاء اللہ لاہور کی جس جس مسجد کے نمازی رحمت کی اس بارش میں بھیگنے پر آمادہ ہوئے وہاں وہاں یہ بادل اٹھیں گے۔

جملہ معترضہ بہت طویل ہو گیا' معذرت تاخیر کی تھی۔ چونکہ افطار اور سحری کے درمیان سونے یا آرام کرنے کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا تھا لہٰذا باوجود خواہش اور کوشش کے' ادارہ "میثاق" کے متعلقین صلاحیت کار کو غیر معمولی حد تک کم ہونے سے روک نہ سکے..... چنانچہ۔

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

انشاءاللہ آئندہ پرچہ بروقت آپ کے ہاتھوں میں ہو گا اور باقاعدگی کے تسلسل کو قائم رکھنے کی بھی امکانی کوشش کی جائے گی' وماتوفیقی الاباللہ

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تنظیم اسلامی کے امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب' ان کی جماعت اور ان کی دعوت کے اعوان و انصار بہت پہلے سے تائید و توفیق ربانی کے طفیل اس شعوری فیصلے پر قائم اور مطمئن ہیں کہ "اظہار دین الحق علی الدین کلہ" بطور مسلمان ہمارا دینی فریضہ ہی نہیں بلکہ پاکستان کے باسی ہونے کے ناتے حب وطن کا بھی اولین تقاضا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب اپنے مقالے میں جو کثیر الاشاعت معاصر روزنامہ جنگ میں بالاقساط "میثاق" میں بحساب ابواب اور کتاب کی شکل میں "استحکام پاکستان" کے نام سے علیحدہ بھی شائع ہوا اور جس کا اندرون و بیرون ملک وسیع پیمانے پر ابلاغ ہوا ہے' پوری شرح و بسط کے ساتھ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ بقاء و استحکام پاکستان کا واحد ذریعہ ملک میں حقیقی اسلام کا واقعی نفاذ ہے۔ پھر لطف یہ کہ قیام پاکستان کے محرکات کے بارے میں جتنے مونہہ جتنی باتیں کرتے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی ابطال کئے بغیر انہوں نے منطق اور برہان سے اپنے اس دعوے کو شک و شبہ سے بہت بلند کر دکھایا ہے کہ اسباب و محرکات کا ذکر چھڑتا ہے تو بات پہنچتی یہیں تک ہے کہ "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ"۔ اس حقیقت کو بھی انہوں نے دو اور دو چار کی طرح ثابت کیا ہے کہ بحالات موجودہ پاکستان میں حقیقی اسلام کا واقعی نفاذ کسی اور حیلے بہانے سے ممکن نہیں' اس کا واحد ذریعہ "اسلامی انقلاب" ہے۔ اس انقلاب کی تعریف' ضرورت اور طریق کار پر کتاب و سنت کی روشنی میں بالعموم اور ان مراحل سے بالخصوص جو اس بجلی کے کڑکے اور صوت ہادی' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی زمین ہلا کر رکھ دینے میں[1] پیش آئے' اپنے مطالعہ کا حاصل بھی وہ گفتگو اور تقاریر میں تو تفصیل سے بیان کر چکے ہیں لیکن تحریر میں منضبط کرنا تا حال باقی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اسی موضوع پر لکھنے کے ارادے کے ساتھ اس وقت "البلد الامین" میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں وہاں کی برکات سے کماحقہ مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ اس اہم موضوع کا حق ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرمائے جو لاریب وطن عزیز کے لئے موت و زیست کا مسئلہ ہے۔ آمین

اس ذکر کی نوبت یوں آئی کہ پرائیویٹ شریعت بل کو پارلیمنٹ سے پاس کرانے کی جو مہم چند ماہ سے ملک میں چل رہی تھی وہ اب آخری مرحلے میں داخل ہوتی نظر آتی ہے۔ ہم اگر یوں کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ "طریق جمہوری" سے نفاذ اسلام کی شاید یہ آخری کوشش ہے۔ اس سے پہلے کیسے کیسے

---

[1] وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی..... حالی

سنہری مواقع ہم گنوا بیٹھے ہیں۔ شمار کو محدود بھی رکھیں تو وہ دو ساز گار مواقع تو قیل و قال سے ماورا ہیں ہی جو قیام پاکستان کے فوراً بعد اور ۱۹۷۷ء کی "تحریک نظام مصطفیٰ" کے نتیجے میں مارشل لاء کی آمد سے میسر آئے۔ ان میں سے موخر الذکر موقع کو اس اعتبار سے ہم زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں کہ رسم دنیا بھی تھی، موقع بھی تھا، دستور بھی تھا۔ احیائے اسلام کے لئے عالمی سطح پر ایسی حرکت دکھائی دیتی تھی جس سے فرنگی بتکدے کے پروہت لرزاں و ترساں تھے۔ برادر ہمسایہ ملک ایران نے لگ بھگ انہی دنوں اور ایسی ہی تحریک کے نتیجے میں اپنے انداز کا اسلامی انقلاب برپا کر کے دکھا بھی دیا۔ ہمارے اپنے ملک میں "پاکستان کا مطلب کیا۔ لا الہ الا اللہ" کا آہنگ ہماری اب تک کی تاریخ میں بلند ترین تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اقتدار و اختیار کا سرچشمہ بھی حسن اتفاق سے ایک ایسا اللہ کا بندہ بن گیا تھا جس کے صوم و صلوٰۃ کا چرچا تو اب تک ہے، دین پسندی کا رجحان اس وقت زیادہ ہی عیاں تھا۔ لیکن آئے بھی وہ، گئے بھی وہ، ختم فسانہ ہو گیا۔ ساڑھے آٹھ سال تک کوس لمن الملک بجا کر انہوں نے "پردہ کر لیا"۔ اب نفاذ اسلام کے باقی ماندہ کام کی ذمہ داری جس کو پورا کرنے کی خاطر انہوں نے قوم سے اپنی صدارت میں پانچ سال کی توسیع "وصول" کی تھی، جمہوری حکومت کے سر ہے کیونکہ انہیں آخر کار "سینے پر پتھر رکھ کر" انتخابات کروانے پڑ گئے تھے۔ تاہم ماحول بایں معنی اب بھی ساز گار ہے کہ نفاذ اسلام کی ہر کوشش کو خاص ان کی آشیرواد حاصل ہے۔ نمائندگان جمہور بھی الا ماشاء اللہ سب کے سب اسلام کے نام پر ووٹ لے کر آئے ہیں۔ سوشلزم کے علم برداروں اور لادینیت کے پرچارکوں کو اسمبلی اور سینٹ کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیا گیا اور علماء و رجال دین بھی جس تعداد میں پارلیمنٹ میں پہنچ گئے ہیں اس کی نظیر سابقہ ایوانوں میں نہیں ملتی۔ لیکن ان سب عوامل کے باوصف بھی شریعت کی بالادستی تا حال ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ نفاذ شریعت کی امیدیں دم توڑتی نظر آتی ہیں ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ متحدہ شریعت محاذ کی شکل میں اجتماعی جدوجہد کی جو ایک کوشش کی گئی تھی اس کا مآل بھی اب تک تو خوش آئند نہیں۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

اس محاذ میں علاوہ دیگر دینی جماعتوں کے جزوی حصوں اور متفرق و محترم علماء کرام کے، اگرچہ تنظیم اسلامی بھی اپنی حیثیت کے ماوجب شعور کے ساتھ شامل تھی لیکن مجوزہ قوت محرکہ "جماعت اسلامی" ہی کو سمجھا گیا۔ بلکہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ حلقہ دیوبند کے جید علمائے کرام کی طرف سے پیش کردہ "شریعت بل" کو کرم فرماؤں نے بطور دشنام "منصورہ برانڈ اسلام" کا نام تک دے ڈالا۔ غالباً حکومت بھی اسی خیال میں ہے۔ اور وزیر اعظم کے مشیر مذہبی امور کا تقرر مع توقیت تقرری ہمارے اس گمان کو تقویت دیتی ہے۔ پیر محمد اشرف صاحب مدظلہ کی نامزدگی تو معلوم ہوتا ہے کہ خاص جماعت اسلامی ہی کو کھدیڑنے کے لئے کی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ہمارے یہ اندیشے درست ثابت ہوئے تو..... اگرچہ اس میں ہمارے لئے ہرگز کوئی خوشی کی بات نہ ہوگی..... ہمارا یہ سوچا سمجھا موقف مزید مبرہن ہو گا کہ نفاذ شریعت فی الحقیقت نظام کی تبدیلی ہے اور نظام کی تبدیلی انتخابی سیاست سے نہیں انقلابی عمل سے ہی لائی جا سکتی ہے۔ البتہ جماعت اسلامی اور اس کے حلقہ ہمدردان کے لئے لمحہ فکریہ ہو گا۔ انہیں فیض کی زبان میں ایک بار پھر یہ کہنا ہو گا۔

یہ فصلِ امیدوں کی ہمدم اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت صبحوں شاموں کی اب کے بھی اکارت جائے گی

رہی "جمہوری حکومت" تو بظاہر نفاذ شریعت اس کے لئے تاحال سانپ کے مونہہ میں چھچھوندر بنی ہوئی ہے کہ نگلے تو اندھا، اگلے تو کوڑھی لیکن میکیاولی سیاست کے پہلوان ڈنڈ پیل رہے ہیں کوئی نہ کوئی داؤ کھیل کر رہیں گے۔ وہ شیخ چلی تو نہیں کہ اسی ٹہنے پر شریعت کی آری چلا دیں جس پر وہ اپنے مفادات سمیت براجمان ہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

صد حیف کہ بنظر غائر دیکھنے سے نقشہ یہ نظر آتا ہے کہ ؎ میں الزام اس کو دیتا تھا، قصور اپنا نکل آیا..... نفاذ شریعت کی مہم اور اس کے لئے کدو کاوش مبارک و مسعود لیکن اس سوال سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے کہ معاشرے کو نفاذ شریعت کی قبولیت کے لئے تیار کرنے کا کام کس نے اور کتنا کیا ہے؟۔ ملک خداداد پاکستان کی وافر نعمتوں سے مستفید ہونے اور مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے کتنے ہی بدبخت تو ایسے بھی یہاں دندناتے پھرتے ہیں جو اسلام ہی نہیں خود اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے (خاکم بدہن) بیزار ہیں اور علی الاعلان اپنی اس ناپاک جسارت کا چرچا بھی کرتے ہیں۔ اس قلیل تعداد سے قطع نظر ابنائے وطن کی عظیم اکثریت اسلام کو صرف "مذہب" کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے۔ اس کے "دین" ہونے کا کچھ دھندلا سا اندازہ معدودے چند لوگوں کو ہے بھی تو بس عقیدت کی حد تک اور غیروں کے آگے ادعا کے لئے۔ اور یہ بھی ثمرہ ہے زمانہ قریب میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور مولانا مودودی رحمھم اللہ کے علوم جدیدہ کے تناظر میں وقیع علمی کام کا۔ وگرنہ اس کے شعوری تصور سے ذہن..... الاماشاءاللہ..... عاری ہیں۔ اپنی نجی، معاشرتی اور کاروباری زندگی پر دین کو حتی الامکان نافذ کرنے والے لوگ اب انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اپنے اللہ سے وعدے وعید کر کے یہ وطن مانگنے والے اتنی جلد نقض عہد کے مرتکب کیوں کر ہوئے۔ اس کے اسباب و علل اور ذمہ داری کی فرد جرم تیار کرنے کے لئے دفتر ہی درکار نہیں چیتے کا جگر اور شاہیں کا تجسس بھی چاہئے۔ البتہ اتنی بات کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ہادی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی تشخیص کے مطابق اپنی شامت اعمال کے باعث ہم "وہن" [1] کا شکار ہو گئے ہیں جس کا علاج

---

[1] یعنی حب الدنیا و کراھیۃ الموت۔ دنیا سے محبت اور موت سے فرار کی خواہش

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور موقع پر موت کو اکثر یاد کرتے رہنا اور قرآن مجید کی بکثرت تلاوت ...... سمجھ کر اور عمل کی نیت سے ...... کرنا بتایا تھا۔ [1]

عوام الناس کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا نہیں "الناس علی دین ملوکھم"۔ وہ تو خواہی نخواہی ہانک ہی لئے جاتے ہیں لیکن دور ملوکیت کے اختتام پر اور بالخصوص موجودہ پرفتن زمانے میں "ملوکھم" میں حکومت تو شامل ہے ہی۔ ذرائع ابلاغ، ادب و دانش، فلسفہ و تعلیم، گروہی مفادات اور بین الاقوامی جوڑ توڑ کے پیر بھی ہاتھی کے اسی پاؤں میں آتے ہیں۔ یہ سب مل کر زور لگا رہے ہیں کہ پاکستان کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا گہوارہ نہ بننے دیا جائے۔ اسلام یہاں اذن باریابی پائے بھی تو چھوٹا بن کر، "کلمۃ اللہ ھی العلیا" نہ ہو۔ دین حنیف کے دور جدید کی اجتہادی ضروریات سے تطابق کے بہانے موم کی ناک بنانے کی خواہش کس کس روپ میں سامنے آ رہی ہے۔ اس جرات رندانہ کی توفیق بھی کبھی کھل کر اور کبھی الفاظ و معانی کے طلسم کی آڑ میں گاہے گاہے جھلک دکھاتی ہے کہ ع خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں ...... یہ تو ہوئی اسلام کا راستہ روکنے کی مثبت کوشش منفی طور پر پوری قوم کو ہر نوع کی دینی اور اخلاقی بے راہ روی کی طوفانی لہروں کے اس طور حوالے کیا جا رہا ہے کہ "دامن ترمکن ہشیار باش" کہنے کے لئے بڑی ہی ہمت کی ضرورت ہے۔ معاشرے کے اس دیمک زدہ ڈھانچے پر شریعت اسلامی کا بار ڈال دیا گیا تو اسے تھام کر رکھنا واقعی "من عزم الامور" ہو گا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سندھ کی صورت حال پر جتنی تشویش کا اظہار "میثاق" کے صفحات پر ہوا وہ ہمارے قارئین کے علم میں ہے بلکہ ہم نے تو محض اظہار تشویش پر اکتفاء نہ کیا، حالات کے عمیق تجزیئے اور ممکنہ حل بھی پیش کئے ہیں۔ یہ تک ہوا کہ امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پر ملک و ملت کے بعض "بہی خواہوں" نے پھبتیاں بھی کسیں کہ شاید انہیں سندھ فوبیا ہو گیا ہے۔ لیکن ع قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم ...... وہاں اغواء کی وارداتوں اور تاوان کے مطالبوں میں خبریت کا کوئی پہلو نہیں رہا۔ لیکن حالیہ دو واقعات جن میں معروف اور کلیدی صنعت کار خاندان کے اہم فرد جناب سلیمان داؤد اور ایک متوسط تاجر و صنعت کار جناب عبدالعزیز غوری پر ہاتھ ڈالا گیا، بہت سی پراسرار اور چونکا دینے والی حکایتوں کو الم نشرح کرنے کا باعث بنے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کیرتھر کے پہاڑی سلسلے میں دہشت گردوں کی ایک متوازی حکومت قائم ہے جس کی روح رواں پڑھے لکھے اور عسکری تربیت یافتہ نوجوان ہیں۔ اسلحے کے ذخائر وافر ہیں، تخریب کاری اور گوریلا طرز جنگ کے تربیتی کیمپ کام کر رہے ہیں اور ان کا رسل و رسائل کا نظام بھی اتنا مربوط ہے کہ ان پر ہاتھ ڈالنا خالہ جی کا گھر نہیں۔

---

[1] کثرۃ ذکر الموت و تلاوۃ القرآن

کیرتھر کا پہاڑی سلسلہ عظیم ترین اور حساس صنعتی علاقے نوری آباد اور کراچی کو باقی ماندہ ملک سے ملانے والی اہم شاہراہ پر ایسے سایہ فگن ہے کہ وہاں سے کسی بھی وقت شب خون مار کے حالات کو نازک موڑ پر لایا جاسکتا ہے۔ اس میں مورچہ بند نوجوانوں کا نظریاتی رشتہ ملحقہ آبادی "سن" میں جی۔ ایم۔ سید صاحب سے بھی بتایا جاتا ہے..... اہل نظر حالات کے تیور خود ہی پہچانیں۔

ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی۔ برائے خدا حکومت سے درخواست کیجئے کہ وقت کو ہاتھ سے بالکل ہی نکل جانے نہ دے۔ ذاتی وقار اور انا کا سوال مسائل کے سیاسی حل میں یوں ہی آڑے آتا رہا تو ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں..... نعوذ باللہ من ذالک

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس اخباری اطلاع سے ذہنی اذیت بھی ہوئی اور روحانی کرب بھی محسوس ہوا کہ مشہور محقق مولانا محمد حنیف ندوی علیل اور کسمپرسی کا شکار ہیں۔ اپنے خرچ پر بغرض علاج لندن تک ہو آئے ہیں لیکن..... شاید اپنے وسائل کی نارسائی کے باعث..... افاقے کی صورت نہیں بنی۔ ان کے معالج نے حکومت سے اپیل کی ہے کہ۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

مولانا کے بعض نظریات سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن اسلام کے لئے ان کا تحقیقی کام اور علم و دانش کے میدان میں ان کی کاوشیں اس "خدمت" سے یقیناً زیادہ وقیع ہیں جو مینا شوری [1] نے "فن" کے لئے انجام دیں۔

ہم بصمیم قلب رب العزت سے دعا کرتے ہیں اور قارئین سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہماری اس دعا میں شریک ہوں کہ وہ انہیں صحت کاملہ عاجلہ عطا فرمائے اور کچھ ایسا انتظام کر دے کہ ان کی مشکل آسان بھی ہو جائے اور ان کی خودداری و عزت نفس پر بھی آنچ نہ آنے پائے۔

---

[1] مسلم فلمی اداکارہ جس نے عالم شباب میں جودھو میں مچائیں ان میں ایک ہندو سے شادی بھی شامل تھی۔ اس کے نام کا لاحقہ "شوری" اسی ہندو شوہر کی باقیات میں سے ہے۔ اب بڑھاپے اور پیچیدہ بیماریوں کا شکار تھی اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی عنایت خسروانہ کی بدولت سرکاری خرچہ پر علاج کیلئے لندن میں مقیم ہے۔

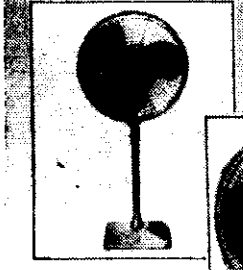

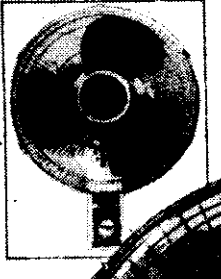

ہوا سے باتیں کرنے والا
رائل فین
خوشنما، خوش وضع، پائیدار اور انتہائی ہموار
رائل فین گرم موسم میں آسائش
کا سامان پیدا کرتا ہے۔
آپ رائل فین پر فخر کر سکتے ہیں۔
سیلنگ فین: "56
قیمت: Rs 675/=
ROYAL
FANS
رفیق انجینئرنگ انڈسٹریز
(پرائیویٹ) لمیٹڈ
رفیق آباد، جی ٹی روڈ، گجرات
گجرات فون: 3004 - 3011
کراچی سیلز آفس، 721491
لاہور سیلز آفس، 301286
راولپنڈی سیلز آفس، 74930

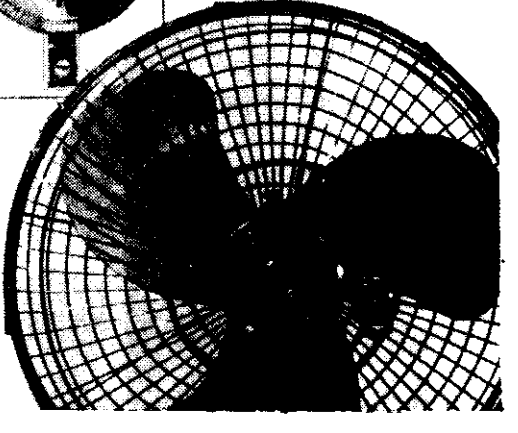

پاکستان ٹیلی ویژن پر نشر شدہ ڈاکٹر اسرار احمد کے دروسِ قرآن کا سلسلہ

الھدیٰ

درس نمبر ۱۱

نشست نمبر ۴۲

مباحثِ عملِ صالح

بندۂ مومن کی شخصیّت کے خدّوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

(۶)

السلام علیکم۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ ج فَقَدْ کَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ۔ صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ط

"اے نبی! فرما دیجئے، میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہارا پکارنا۔ سو تم جھٹلا چکے ہو اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی۔"

محترم ناظرین اور معزز سامعین!

یہ سورۃ الفرقان کی آخری آیت ہے اس سورۂ مبارکہ کے آخری رکوع کا جو درس ان نشستوں میں ہوا ہے، اس کا اصل مضمون تو پچھلی نشست میں ختم ہو گیا ہے یعنی یہ کہ عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا ہیں! ۔ اور از روئے قرآن ایک پوری طرح تعمیر شدہ انسانی شخصیت کے خدوخال کیا ہیں! یا علامہ اقبال کے الفاظ میں 'مردِ مومن' کے خصائص کیا ہیں! سورۃ الفرقان کی یہ آخری آیت جو ابھی آپ نے سنی اور اس کا رواں ترجمہ بھی سماعت فرمایا۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں اور اس سورۂ مبارکہ

کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۝ "بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان یعنی قرآن مجید۔ اپنے بندے پر یعنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن جائیں"۔

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزا ہیں۔ ایمان باللہ یا توحید۔ ایمان بالآخرہ یا معاد۔ ایمان بالرسالت۔ ہم پڑھ چکے ہیں کہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ یاد ہوگا کہ فرمایا گیا تھا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ کیا ہے! ایمان باللہ۔ سورہ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت، جس کی میں نے ابھی تلاوت کی، ان دونوں کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت و رسالت کی غرض و غایت کیا ہے! سورہ النسآء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے فرمایا: رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ "ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر، کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی زبردست، غالب، حکمت والا"۔ معلوم ہو کہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد تھا، اتمام حجت اور قطع عذر تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے!۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو اُسے سماعت و بصارت اور عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا۔ یہ ہے بنیادی اور ابتدائی حجت جو ہر انسان پر

قائم ہے۔ لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسولؐ تشریف لاتے ہیں۔ رسولوں نے حق کو پیش کر دیا۔ قولاً بھی پیش کر دیا اور عملاً بھی پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی ترغیب دی ہے تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا ہے۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی ہے تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرما دیا ہے۔ عدل و قسط کی تاکید کی تو دوست و دشمن کی تمیز و امتیاز کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا ہے۔ عفو اور نصح کی نصیحت کی تو اپنے جان کے دشمنوں اور اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا ہے۔ جو دعوت دی اُس کا نمونہ عملاً لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً حجت آخری درجہ میں قائم ہو گئی۔ جیسا کہ یہی ہے وہ حقیقت جو سورہ النساء کی اُس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے جو میں ابھی آپ کو سنا چکا ہوں۔

یہی مضمون ہے جو سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رسل کی اس مقدس جماعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول بشیر و نذیر ہو کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون بتکرار آیا ہے: وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۔ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۔ اور وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۔ ہودؑ کو بھیجا ہم نے اس کی قوم عاد کی طرف۔ صالحؑ کو ہم نے بھیجا اس کی قوم ثمود کی طرف۔ اور شعیبؑ کو بھیجا ہم نے مدین میں رہنے والی اُس کی قوم کی طرف۔ چنانچہ مطالعہ قرآن کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہ نبوت اور رسالتیں علاقائی یا قومی ہوتی تھیں۔ لیکن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام و اتمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی، اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید، فرقانِ حمید اسی مقصد کے لئے نازل فرمایا گیا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۔

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظ مبارکہ فرمائی گئی: وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ اور سورۃ سبا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقی و

عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۝ "اور (اے نبی) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیراً اور نذیر بنا کر"۔ لیکن یہ بات جان لیجئے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان، دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ، ہمیں معلوم نہیں تھا، ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری مرضا کیا ہے۔ رسولوں کے آنے کے بعد عذر ختم ہو گیا۔ اب محاسبہ شدید ہو گا، اب پکڑ سخت آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار ان قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا، ان کی تکذیب کی، ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور ان چند لوگوں کو جو ان رسولوں پر ایمان لائے تھے بچا لیا، اور ان قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں، تبلیغ کر رہے ہیں، تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں، ایک ایک گھر پر جا کر پیغام ربانی پہنچا رہے ہیں، ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا تو ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ چونکہ سنت اللہ یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبہ کر دیا جائے، اُسے خبردار کر دیا جائے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا "ہم عذاب بھیجنے نہیں رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرما دیں"۔ یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمام حجت نہ ہو جائے، اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے رب کا پیغام پہنچا دیا، تمہارے سامنے تمہارے ربّ کی دعوت پیش کر دی۔ مجھ تک جو ہدایت ربانی آئی تھی، اُسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے

پیش کر دیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لئے کیا گیا ہے ورنہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے: مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ ۔ یہ تبلیغ دعوت اس لئے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا: لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۔ تو رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی۔ لیکن: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ۔ تم جھٹلا چکے، تم تکذیب کر چکے۔ عربی زبان میں فعلِ ماضی پر جب 'قَدْ' کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں PRESENT PERFECT TENSE کا جو مفہوم ہوتا ہے۔ یعنی کام ہو چکا ہے، بات ہو چکی ہے۔ تو یہی مفہوم ہوتا ہے جب عربی میں فعل ماضی پر 'قد' کا اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ ۔ سو لوگو، تم جھٹلا چکے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آ کے رہے گی: فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۔ لازم و ملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لِزَامًا کے معنی ہوں گے جیسے کوئی چیز چیٹ کر رہ جائے، چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا: فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۔ سو تم نے دعوتِ ربانی کو جھٹلا دیا پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔ تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لئے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اوّلین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنفسِ نفیس خلقِ خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے بلکہ ہمارے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوّت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے، رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے، اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں عرض کر چکا ہوں کہ حضورؐ کی بعثت ہے پوری نوعِ انسانی کے لئے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپؐ ہی کا دورِ رسالت تا قیامت جاری ہے۔ یہ دور بھی جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، یہ بھی دورِ رسالتِ محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہو گا۔ وہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ دعوت میں شامل ہے اور ہو گا۔ ہاں اُمّتِ اجابت میں وہی شامل ہو گا

جو نبی اکرمؐ کی دعوت پر لبیک کہے، حضورؐ کی تصدیق کرے، حضورؐ پر ایمان لائے۔ لیکن امّتِ دعوت سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے قوم عاد تھی، حضرت ہود علیہ السلام کی اُمّتِ دعوت۔ جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اُمتِ دعوت تھی قوم ثمود۔ تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت دعوت ہے پوری نوع انسانی۔ اور پیغام ربانی کو جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفسِ نفیس اُن لوگوں کو پہنچایا جو آپؐ کے مخاطبین اوّلین تھے۔ اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ حضورؐ نے یہ فریضہ دعوت انجام دیا تکلیفیں جھیل کر، مصیبتیں اٹھا کر۔ آپؐ کا تمسخر بھی ہوا، استہزا بھی ہوا، آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا۔ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر جبکہ آپؐ سربسجود تھے۔ اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں پر آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسدِ اطہر لہولہان ہوگیا اور جسم سے خونِ اقدس بہہ بہہ کر نعلین شریف جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپؐ نے جھیلیں لیکن دین کا پیغام پہنچا کر حجّت قائم کردی۔

اب یہ کام امّتِ مسلمہ کے ذمہ ہے، میرے اور آپ کے ذمہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمّتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فرد بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بری الذمہ ہوجائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو رد کریں اور اُس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ ہوں گے ذمہ دار۔ سارا بوجھ ان پر آئے گا۔ لیکن اگر معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہوگئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دوہری ذمّہ داری آگئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا، ان تک پیغام نہیں پہنچ رہا۔ انذار نہیں ہو رہا، دعوتِ ربّانی کا حق ادا نہیں ہو رہا۔ تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا حال تو یہ

ہے کہ اگرچہ ہم خود قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں، لیکن الا ماشاء اللہ ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب قومی ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوّت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے، جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضورؐ کو نبی اور رسول مان لیا جائے۔ لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ درحقیقت تکذیب عملی ہے۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجمعہ میں آئی ہے: مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ "مثال ان کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے۔ پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری) کو ادا نہ کیا، اُس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو اور بہت بُری ہے مثال اُس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی" وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ "اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا"

اب آپ اس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے: بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ - ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے تورات کی زبان سے کبھی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! وہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتابُ اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ توراۃ پر ایمان کا دعوٰے کرنے والے اگر اُس کے احکام پر کاربند نہیں ہیں۔ تورات کے نواہی سے اگر اجتناب نہیں کیا جا رہا۔ تورات نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کی جا رہی ہے، اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویّہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے، حضورؐ نے ارشاد فرمایا: يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ

"اے قرآن والو!"۔ جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے خطاب ہوتا ہے یٰاَھْلَ الْکِتٰبِ کے الفاظ سے۔ محبوب ربّ العٰلمین ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں: یٰاَھْلَ الْقُرْاٰن کے الفاظ سے ——— ارشاد ہوتا ہے: یٰاَھْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَّوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ "اے قرآن والو! قرآن کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا۔ اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا" تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے: وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَاءِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ "پڑھو اُسے جیسا کہ اُس کے پڑھنے کا حق ہے۔ رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ وَافْشُوْهُ "اسے پھیلاؤ، اُسے عام کرو، اس کی تبلیغ کرو، اس کے نور سے چہار دانگِ عالم کو منوّر کرو" وَتَغَنَّوْهُ۔ "اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو۔ کہ اس سے تمہاری رُوح کو غذا میسّر آئے"۔ وَتَدَبَّرُوْا فِیْهِ "اور اس میں تدبّر کرو، غور و فکر کرو" وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ: وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا۔ بلکہ تدبّر ہو، غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا: لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ "تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرمؐ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور پہلی عملی تکذیب ہے۔ اس معنی میں اس آیتِ مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں: قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ ——— اے نبیؐ! ان لوگوں کے کان کھول دیجیئے، انہیں یہ بات سنا دیجیئے کہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے بلکہ اس نے اگر مجھے بھیجا ہے، مجھے اگر مبعوث فرمایا ہے مجھ پر اگر یہ قرآن نازل فرمایا ہے۔ تو صرف اس لئے کہ تم پر اتمامِ حجّت کرنا مقصود ہے ——— لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجّت قائم کر دی ہے لیکن: فَقَدْ کَذَّبْتُمْ۔ تم جھٹلا چکے ہو، تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے۔ خواہ یہ جھٹلانا ——— قولاً ہو یا عملاً ہو۔ تو ——— فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا۔ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی۔ اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے

گی - اللہ تعالےٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے -

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے، اس کے بارے میں اگر کوئی سوال یا اشکال ہو تو اس کے لئے میں حاضر ہوں -

سوال و جواب

سوال : ڈاکٹر صاحب! ایک شخص خود تو تبلیغ کرتا ہے لیکن اس پر خود عمل نہیں کرتا - اس کے بارے میں آپ کیا رائے ہے ؟

جواب : بالکل واضح بات ہے کہ ایسا شخص اپنی دعوت کو بھی بدنام کرتا ہے اور اپنا وقت بھی ضائع کرتا ہے - اس لئے کہ جب تک کسی داعی کا اپنا کردار اپنی دعوت سے مناسبت رکھنے والا نہیں ہوگا، اُسکی دعوت غیر مؤثر رہے گی - اس سے پہلے ہم سُورۃ حٰمٓ السجدہ کی آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ : وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ - جو بھی اللہ کی طرف بلائے اس کا عمل بھی درست ہونا چاہیئے تب ہی اس کی دعوت و تبلیغ میں اثر ہوگا -

سوال : ڈاکٹر صاحب! عذابِ آخرت کے بارے میں قرآن مجید میں اتنی وضاحت کے باوجود لوگ گناہوں کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں - ؟

جواب : بڑا عملی سوال ہے اور ہماری نشستوں میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ یہ سوال ہوا تھا تو میں نے اُس وقت جو بات عرض کی تھی، وہی دوہرا رہا ہوں کہ اصل کمی یقین کی ہے ہمیں ان باتوں پر جیسا یقین ہونا چاہیئے اگر واقعتہً ویسا یقین حاصل ہو جائے تو پھر ہمارا عمل بدل جائے گا - اس وقت ہماری بالعموم جو صورتِ حال ہے وہ یہ ہے کہ ہم مانتے تو ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ آخرت حق ہے اس میں جزا و سزا کا معاملہ ہوگا - لیکن ہمارا یہ ماننا بالعموم اقراراً باللسان کے درجہ تک ہے - لیکن اس پر تصدیق بالقلب یعنی دلی یقین والی کیفیت بدقسمتی سے ہمیں حاصل نہیں ہے - اسی قلبی یقین کی ضرورت ہے - بقول علامہ اقبال ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

سوال : ڈاکٹر صاحب! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں کے سامنے دین کو پیش کیا اور انہوں نے آپؐ کی بات کو رد کر دیا اور اس دور میں جو لوگ غیر مسلموں کو حق کی دعوت دیتے ہیں، حق کی تبلیغ کرتے ہیں اور وہ اس کو رد کر دیتے ہیں تو حضورؐ کے دور کے کافروں اور اس زمانہ کے منکروں کی سزا میں کچھ تناسب و فرق ہوگا یا دونوں کو ایک سی سزا ملے گی۔؟

جواب : میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی سزا کے درمیان لازماً فرق رہے گا۔ اس لئے کہ نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے جس درجہ کا اتمام حجت کسی غیر نبی اور غیر رسول کے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ہم لاکھ کوشش کریں تب بھی ہمارے دامن کردار پر کوئی نہ کوئی دھبہ رہ ہی جائے گا۔ اور ہم دعوت و تبلیغ کے لئے جن سے مخاطب ہونگے وہ ہمارے دامن کے اس داغ کو ہماری دعوت کو رد کرنے کے لئے جواز کا ذریعہ بنا لیں گے۔ تو یہ پہلو کبھی نہ کسی درجہ میں موجود رہے گا۔ اسی طرح جو معاملہ اُن اُمتوں کے ساتھ ہوتا تھا کہ جن کی طرف رسول بھیجے گئے اور انہوں نے انکار کیا تو ان کو ملیامیٹ کر دیا گیا نیست و نابود کر دیا گیا تو یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے اختتام کے بعد نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔ البتہ یہود کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے ان کی طرف حضرت عیسیٰ ابن مریم مبعوث ہوئے تھے علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ وہ دوبارہ دُنیا میں بحیثیت امتی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائیں گے اور پھر ان کے ہاتھوں، یہودی اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے اور ان کو عذابِ استیصال سے دوچار ہونا پڑے گا۔

حضرات! مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا آج درس نمبر ۱ مکمل ہو گیا جس کا سلسلہ وار مطالعہ ہم ان نشستوں میں کر رہے ہیں۔ اب انشاء اللہ آئندہ ہم بارہویں درس کا آغاز کریں گے اور یہ درس مسلمانوں کی عائلی زندگی کے متعلق ہے۔ اس لئے کہ انفرادیت سے جب اگلا قدم اجتماعیت کی طرف اٹھتا ہے تو اجتماعیت کی پہلی منزل خاندانی اور عائلی زندگی ہے۔ اس کے ضمن میں ان شاء العزیز ہم اگلی نشست سے سورۃ التحریم کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کریں گے۔ ●●●●●

موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کا طریق کار

انقلابِ نبویؐ کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد کے خطباتِ جمعہ کا سلسلہ

ترتیب و تسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ امیر تنظیم اسلامی نے ۳۱ر اگست اور ۲۸ر ستمبر ۸۴ء کے خطابات جمعہ میں "کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے؟" اور "کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟" کے موضوعات پر بالترتیب خطاب فرمایا تھا۔ یہ دونوں خطاب ماہنامہ میثاق میں طبع ہو چکے ہیں۔ آخرالذکر خطاب میں یہ سوالیہ نشان سامنے آیا تھا کہ اب ہمیں یہ سمجھنا ہو گا کہ خالص محمدیؐ انقلاب کیا ہے اور اس کا طریق کار کیا ہے؟..... چنانچہ اس موضوع پر امیر محترم کے خطاباتِ جمعہ کی تعداد نو بن گئی۔ جنہیں کیسٹ سے منتقل کیا گیا اور "اسلامی انقلاب۔ مراحل، مدارج اور لوازم" کے عنوان سے ان کی اشاعت جون ۸۵ء کے میثاق سے شروع ہو کر اپریل ۸۷ء کے شمارے میں ختم ہوئی۔ آخری خطاب میں امیر محترم کے اختتامیہ کلمات یہ تھے کہ "اب انشاءاللہ العزیز اگلے جمعہ سے مجھے اس موضوع پر گفتگو کرنی ہے کہ موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کن امور میں حضورؐ کا منہج عمل ہمیں جُوں کا توں اختیار کرنا ہے اور کن کن امور میں کن کن پہلوؤں سے ہمیں اپنے طریق انقلاب میں کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنی ہوگی۔ ظاہر بات ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے ضروری ہو گا کہ یہ ترمیم یا تبدیلی دین کے کسی اصول کی روشنی ہی میں کریں اور یہاں ہمیں حالات کے اعتبار سے کوئی اجتہاد کرنا ہو گا۔ یہ موضوع نہایت اہم ہے چونکہ اس کا تعلق ہماری اپنی عملی زندگی کی اس ذمہ داری سے ہے جو فریضہ اقامت دین کی جدوجہد کی صورت میں ہمیں ادا کرنی ہے۔" ..... چنانچہ ۷ر دسمبر ۸۴ء کے خطابِ جمعہ سے امیر محترم نے اس موضوع پر خطابات شروع کئے جن میں سے پہلا خطاب کیسٹ سے منتقل کر کے معمولی حک و اضافہ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے۔ (ج ر)

حضرات و خواتین.....!

اس مسجد دارالسلام میں جمعہ کی تقاریر کے سلسلہ میں آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے تو ہم نے انقلاب ایران کے موضوع پر دو جمعوں میں گفتگو کی تھی۔ پھر ہم نے اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج' لوازم کو سمجھنے کے لئے سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے معروضی مطالعہ سے گفتگو کا آغاز کیا تھا جو اغلباً نو جمعوں تک جاری رہا جس میں ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ انسانی کا جو عظیم ترین اور کامل ترین انقلاب برپا کیا تو اس کے لئے حضورؐ نے کیا طریقہ اختیار فرمایا! اور حضورؐ کو کن کن مراحل سے گذرنا پڑا!! اس لئے کہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جو لوگ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہیں' جو محبت و عقیدت رکھتے ہیں' ان کی نگاہ میں حضورؐ کا جو مقام ہے وہ تو ہے ہی۔ لیکن جو لوگ آپؐ پر ایمان نہیں رکھتے' بلکہ حضورؐ سے عداوت رکھتے ہیں وہ بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں اور اس کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ انسانی کا عظیم و کامل ترین انقلاب وہ تھا جو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے برپا کیا۔

میں اپنی سی امکانی کوشش کر چکا ہوں کہ سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کا ایک مطالعہ اور ایک جائزہ اس انداز میں آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں کہ اسلامی انقلاب کے مراحل اور مدارج نکھر کر سامنے آجائیں۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اسی بات کا پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ میں نے "فلسفہ انقلاب" سمجھانے کی سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے مطالعہ سے ہے۔ میرا واحد ذریعہ معلومات صرف اور صرف سیرتِ طیبہ ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں اور پورے یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص مجرد انقلابی عمل کو سمجھنا چاہے کہ وہ کیا ہے؟..... تو میرے نزدیک کسی بھی حقیقی اور واقعی انقلاب کے طریق کار کو جاننے کا واحد ذریعہ (SOURCE) صرف اور صرف سیرت النبی ہے علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام۔

میرا یہ دعویٰ بے بنیاد نہیں ہے بلکہ اسے پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لئے میں متعدد شواہد پیش کر سکتا ہوں۔ آپ غور کیجئے کہ ایک انسانی زندگی کے وقفہ (LIFE SPAN) میں' اور وہ بھی کل ۲۳ برس میں ایک عظیم انقلاب برپا کر دینا تاریخ انسانی میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے۔ اور یہ ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک سے' ایک فرد واحد سے دعوت کا آغاز ہوا اور اسی فرد کے ہاتھوں انقلاب کے تمام مراحل اس طور سے طے پا جائیں کہ لکھو کھا مربع میل کے ایک ملک پر ایک بالکل نیا نظام بالفعل قائم ہو جائے اس کی کوئی اور مثال پوری انسانی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ میں بھی اس کی کوئی مثال و نظیر نہیں ملتی۔ اسی لئے میں نے جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ خصوصاً آغاز وحی سے لے کر اس دنیا سے

رحلت فرمانے کا جو قریباً ۲۳ سال کا عرصہ بنتا ہے' اسے قدرے تفصیل سے مرحلوار بیان کیا ہے تاکہ اس مختصر عرصہ کی جو ہمہ گیر و ہمہ جہت جدوجہد ہے' اس کی روشنی میں ہم یہ بات اچھی طرح جان سکیں کہ ایک حقیقی اور واقعی اسلامی انقلاب کن کن مراحل اور مدارج سے گذرتا ہے اور اس کے لوازم کیا ہوتے ہیں! نیز یہ کہ ہمیں اگر اسلامی انقلاب لانے کی جدوجہد کرنی ہے تو اس کے لئے ہمیں لازماً اصل رہنمائی سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہی سے حاصل کرنی ہوگی۔

غور کا مقام البتہ آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ دو اعتبارات سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور اور ہمارے دور کے حالات میں ایک اہم اور بنیادی فرق ہے جسے کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں گہرے غور و فکر اور نہایت احتیاط کے ساتھ یہ دیکھنا ہوگا کہ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی انقلابی جدوجہد کے کن کن مراحل اور امور کو ہمیں جوں کا توں لینا ہوگا اور وہ کون سے مراحل ہیں کہ جن کے بارے میں حضورؐ کی سیرت مبارک کو من حیث المجموع سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ حالات کے پیش نظر استنباط کرنا ہوگا اور کس حد تک اس معاملے میں ہمیں اجتہاد کرنا ہوگا۔ اس مسئلہ پر گفتگو سے قبل آیئے پہلے اس فرق کو سمجھیں جو دو اعتبارات سے واقع ہوا ہے۔

پہلا فرق: پہلا واضح ترین اور نمایاں ترین فرق تو یہ واقع ہوا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہوئی تھی ایک خالص کافرانہ و مشرکانہ معاشرے میں..... جبکہ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق ایک مسلمان معاشرہ سے ہے اور ہمیں اس میں کام کرنا ہے۔ ہمارے ملک ہی کی طرح دوسرے بہت سے مسلم ممالک ہیں جن میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد اسّی فیصد سے زائد ہے اور ان تمام ممالک کے سربراہ اور حکمران بھی مسلمان ہی ہیں۔ رعایا اور حکمرانوں کے کردار' ان کے اخلاق' ان کی سیرت اور دین سے ان کے عملی تعلق کے معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے یہ بات تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ یہ سب کے سب قانوناً مسلمان ہیں۔ صورتِ واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ کہیں بھی مکمل اسلامی نظام اپنی آئیڈیل صورت میں عملاً قائم و نافذ نہ ہو بلکہ پورا کا پورا لادینی (SECULAR) نظام رائج ہو تب بھی وہ مسلمان معاشرہ کہلائے گا اور اس کے حکمران مسلمان ہی تسلیم کئے جائیں گے۔ پھر حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان معاشروں میں کردار کے اعتبار سے ہر طرح کے طبقات موجود ہیں۔ شرابی' زانی' قمارباز اور کئی اعتبارات سے صرف اسلامی اخلاق و کردار ہی سے نہیں عام انسانی سیرت و کردار سے تہی دست افراد بھی موجود ہیں۔ اور اسلامی نظام کے عملاً نافذ نہ ہونے کے باوجود انہی معاشروں میں کچھ نہ کچھ ایسے مسلمان بھی لازماً موجود ہوں گے جو نمازی' روزے دار' اسلامی شعائر کے پاس داری کرنے والے اور انفرادی سطح پر صالح اور متقی مسلمان

ہوں..... بہرحال عملاً یہ تمام لوگ قانوناً مسلمان ہیں اور انہیں کلمہ کی ڈھال حاصل ہے۔ لہٰذا ان حالات میں جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی انقلابی دعوت پیش کی اور اِس صورتِ حال میں جس سے ہمارا سابقہ ہے' ایک نہایت نمایاں فرق موجود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جس معاشرے سے مقابلہ تھا' وہ فکری و عملی دونوں اعتبارات سے خالص مشرکانہ اور کافرانہ معاشرہ تھا اور ان کا پورا نظام شرک کی بنیادوں پر استوار اور قائم تھا۔ کچھ سعید روحیں ضرور موجود تھیں جو فکری طور موحد اور عملی طور پر بت پرستی کی نجاست کی آلودگی سے محفوظ تھیں۔ لیکن غالب اکثریت مشرکین ہی کی تھی۔ چنانچہ پہلا اور بنیادی فرق یہ ہے کہ جس کو سامنے رکھ کر ہمیں سوچنا ہو گا کہ آیا ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا منہج انقلاب جُوں کا توں اور بعینہٖ اختیار کریں گے یا اس میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا!

دوسرا فرق : دوسری اہم بات یہ ہے کہ نوعِ انسانی کا جو تمدنی ارتقا ہوا ہے اس کے اعتبار سے اب کسی بھی ملک میں جو حکومت ہوتی ہے اس کے پاس تمام وسائل ہوتے ہیں' اور تمام قوت ہوتی ہے' پھر ان دونوں کا نہایت منظم ارتکاز ہوتا ہے۔ جبکہ عوام بالکل نہتے ہو گئے ہیں۔ تو ان دونوں کے مابین فرق و تفاوت اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ وہ جو مسلح تصادم (ARMED CONFLICT) والا مسئلہ ہے یعنی پہلے سے قائم شدہ باطل نظام سے مسلح تصادم کا جو معاملہ ہے وہ نظری اور عملی دونوں اعتبارات سے قریباً ناممکن کے درجہ تک پہنچ چکا ہے۔

——— یہ دونوں تبدیلیاں ایسی بنیادی ہیں کہ ان کو سامنے رکھ کر ہمیں معروضی طور پر غور کرنا ہے کہ اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا تہیہ اور عزم کرتے ہیں تو ان تمام مراحل میں جن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد اور سعی کوشش گذری آیا ہمیں بعینہٖ وہی طریقہ اختیار کرنا ہو گا جو ہمیں سیرت مطہرہ میں ملتا ہے یا یہ کہ ان اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر مرحلہ پر ہم یہ دیکھیں کہ کس کس پہلو سے ہماری APPROACH (لائحہ عمل) مختلف ہو گی۔

ایک اہم گذارش : اس سے قبل کہ میں گفتگو آگے بڑھاؤں آپ سے گذارش کروں گا کہ میری اس گفتگو کو سنتے ہوئے آپ فی الحال شعوری طور پر اپنے ملک یا اپنے حالات کو ذہن سے نکال دیجئے۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ پھر گفتگو بڑی گڈمڈ ہو جائے گی اور قدم قدم پر میری گفتگو اور ملک کے تناظر میں ٹکراؤ پیدا ہو گا۔ بلکہ ابھی تک میری گفتگو میں ایک عمومیت اور تعمیم ہے کہ ہم فرض کر رہے ہیں کہ ایک مسلمان ملک ہے جس میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ چاہے ان کا اخلاق' ان کا اپنا کردار' دین کے ساتھ ان کا اپنا معاملہ اور بحیثیت مجموعی اسلام سے ان کا عملی تعلق حوصلہ افزا نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک مایوس کن اور حوصلہ شکن بھی ہے۔ پھر یہ کہ وہاں کے حکمران بھی

مسلمان ہی ہیں خواہ وہ عمل کے اعتبار سے مسلمان کہلانے کے مستحق نہ ہوں بلکہ ان کے افعال کے ڈانڈے فسق و فجور سے ملتے ہوں اور خواہ وہ نمازی اور روزے دار ہوں۔ دونوں حالتوں میں وہ ہیں مسلمان..... لیکن اس ملک میں اسلامی بالفعل قائم و نافذ نہیں ہے۔ یا اگر ہے تو بہت ہی سرسری سا اور سطحی سا اور محض نمائشی ہے۔ اسلامی نظام کا جو اصل الاصول ہے 'اس کی جو حقیقی اقدار ہیں' زندگی کے تمام اجتماعی شعبوں پر اس کی جو گرفت ہے ان میں سے کوئی چیز بھی وہاں عملاً موجود نہیں ہے۔ اس صورت حال کو ایک مفروضہ کی حیثیت سے سامنے رکھئے۔ اور سردست اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ میں اس وقت پاکستان کی حکومت اور اس کے معاشرہ کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہا ہوں۔ بصورت دیگر اس مسئلہ میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں..... ہمیں معاملہ کو اصولاً سمجھنا ہے اور پھر اس اصول کا انشاءاللہ ہم اپنے حالات پر بھی انطباق کریں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں یہ احتیاط اور یہ تدریج لازمی ہے۔

میں آپ حضرات کو یاد دلاؤں گا کہ ہم نے اس سے قبل نو جمعوں میں خالص معروضی طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مطہرہ میں انقلابی مراحل کا مطالعہ کیا۔ اس طویل گفتگو میں ہم کسی بھی موجودہ مسلمان معاشرہ اور ملک کے معاملات کو سرے سے زیر بحث نہیں لائے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کے نقشہ پر جو آزاد مسلمان ممالک پائے جاتے ہیں 'ان میں رہنے والے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا اسلام پر چند انفرادی عبادات کی حد تک عمل موجود' بلکہ بعض ممالک میں اسلامی حدود و تعزیرات بھی نافذ ہیں لیکن یہ بڑی تلخ اور مبرہن حقیقت ہے کہ کسی بھی آزاد مسلم ملک میں اسلامی نظام کامل حیثیت (TOTALITY) میں قائم و نافذ نہیں ہے۔ یہ ہے وہ صورت مسئلہ (PROPOSITION) جسے سامنے رکھ کر ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔

انقلابِ نبویؐ کے مراحل کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

میں اس ضمن میں آج صبح سوچ رہا تھا کہ اصلاً تو ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ میں نے انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جو چھ مراحل بیان کئے تھے' انطباق کے مسئلہ میں بھی وہی ترتیب اختیار کروں۔ اسی ترتیب سے اپنی گفتگو کو آگے چلاؤں۔ یعنی پہلے اس مسئلہ پر اظہار خیال کروں کہ دعوت کے مرحلہ میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا' یا نہیں ہو گا..... اگر ہو گا تو وہ کیا ہو گا.....! پھر تنظیم کے مرحلہ اور اس کے طریق کار میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا اگر ہو گا تو کیا ہو گا.....!! تربیت کے عمل میں کوئی فرق و تفاوت ہو گا یا نہیں ہو گا..... اگر ہو گا تو کیا ہو گا.....!!! اسی کے ساتھ ہے صبر محض (PASSIVE RESISTANCE) کا مرحلہ..... جس کے بعد ہے اقدام

(ACTIVE RESISTANCE) کا مرحلہ..... گنتی اور ترتیب کے اعتبار سے تو یہ دونوں مرحلے چوتھے اور پانچویں نمبر کے طور پر بیان ہوتے ہیں جبکہ حقیقت کے اعتبار سے صبر محض کا مرحلہ پہلے مرحلہ یعنی دعوت کے ساتھ ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔

البتہ آگے چل کر اس کی نوعیت و کیفیت بدل جاتی ہے۔ آخری مرحلہ مسلّح تصادم یعنی (ARMED CONFLICT) آیا اس میں بھی کوئی فرق و تفاوت ہے یا نہیں ہے اگر ہے تو وہ کیا ہے؟؟۔

ہماری ترتیب: لیکن مجھے بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے احباب اس آخری مرحلہ یعنی مسلح تصادم کے بارے میں اپنے ذہن میں کافی تشویش لئے ہوئے ہیں اور اس کے بارے میں یہ معلوم کرنے میں نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ بیتاب ہیں کہ ایک مسلمان معاشرہ اور ایک مسلمان حکومت میں اس مرحلہ کو کس طور پر طے کیا جائے گا..... لہٰذا میں نے سوچا کہ اگر ابتدائی مراحل سے گفتگو کا آغاز کروں گا تو شاید احباب اس کے اندر دلچسپی محسوس نہ کریں اور اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول نہ کر سکیں جو مطلوب ہے چونکہ ان کے اذہان پر تو مسلح تصادم والے مرحلہ کا تسلط زیادہ ہے اور وہ اس کے انطباق (Application) کو پہلے جاننے کے متمنی ہیں۔ لہٰذا میں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں اب اس سلسلہ بیان میں عکسی ترتیب سے بات شروع کروں چونکہ جو آخری مراحل ہیں قانونی اعتبار سے سب سے بڑا فرق انہی میں واقع ہوتا ہے۔ ان کے متعلق ہمیں غور کرنا ہو گا کہ موجودہ حالات میں ان مراحل کو عبور کرنے کی سبیل کیا ہو گی.....؟ صبر محض (Passive Resistance) ہو گا تو کیا ہو گا.....!! اقدام (Active Resistance) کی صورت کیا ہو گی؟ آیا کوئی بغاوت ہو گی! حکومت کے خلاف کھلم کھلا اعلان جنگ کیا جائے گا۔ ! پھر یہ مسلح بغاوت کرنی ہو تو دیکھنا ہو گا کہ آیا شریعت میں اس کی اجازت ہے.....!! اگر ہے تو اس کی شرائط کیا ہیں!! اس لئے کہ یہ دین کا مسئلہ ہے..... جب ہم دین کے لئے کام کرنے چلے ہیں تو ہمیں اپنے کام کے لئے اجازت دین ہی سے درکار ہو گی۔ شریعت میں اگر اس کی سرے سے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ یہ دروازہ تو بالکل بند ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اجازت ہونے کی صورت میں بحالات موجودہ وہ ممکن العمل ہے بھی یا نہیں.....؟؟ میرے نزدیک یہ بات دوسرے درجہ کی ہے۔

پہلے درجہ میں تو ہمیں دین کا حکم معلوم کرنا ہو گا کہ آیا مسلح تصادم کے ضمن میں جواز کا کوئی امکان ہے یا نہیں ہے! پھر اگر جواز کی صورت موجود ہو تو یہ سوال پیدا ہو گا کہ اس کے لئے بالفعل بھی کوئی امکان ہے یا نہیں.....!!

آج کی گفتگو کا موضوع: میں آج ان دو مسئلوں ہی کو اپنی آج کی گفتگو کا موضوع بنا رہا ہوں۔ اس طرح ایک عکسی ترتیب سے بات شروع ہو گی۔ مجھے آج یہ بتانا ہے کہ اگر مسلح بغاوت کی کوئی

صورت ممکن نہ ہو تو اس کا متبادل طریق یعنی Alternate Procedure کیا ہو سکتا ہے؟ جس کے تحت کسی قائم شدہ ملک میں قائم شدہ پورے کا پورا نظام بدلا جا سکے اور اس نظام کو چلانے والی حکومت کو ہٹایا جا سکے اور اس کی جگہ ایک کامل تبدیلی (Total change) لائی جا سکے۔ یعنی نظام کے اعتبار سے بھی اور اس کے چلانے والے ہاتھوں کے اعتبار سے بھی یہ تبدیلی کامل و مکمل ہو۔

موضوع کی نزاکت: ان چند تمہیدی باتوں ہی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ بڑا نازک مسئلہ اور بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ لیکن اس دور میں اسلامی انقلاب کے برپا ہونے کی بظاہر احوال کوئی صورت ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم اس مسئلہ کو تمدنی ارتقا کی روشنی میں حل نہ کر سکیں اور اس کے صحیح متبادل طریقہ (Alternate Procedure) کو تلاش نہ کر سکیں۔ چنانچہ اس اعتبار سے بھی یہ مسئلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے چونکہ ہمارا اصل ہدف اسلامی نے انقلاب برپا کرنا ہے۔ میں پورے صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہوئے کہ مجھے حق بات ہی کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے اور حق کے کہنے کی بھی ہمت عطا فرمائے، اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کروں گا۔ ساتھ ہی میں آپ سے بھی اسی دعا کرتا ہوں کہ آپ بھی میرے لئے مسلسل یہی دعا کیجئے چونکہ اس قسم کے پیچیدہ اور نازک مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بسا اوقات انسان غیر ارادی طور پر یا بے احتیاطی کے باعث اگر کہیں سخت الفاظ استعمال کر جائے تو بات پیچیدگی اختیار کر سکتی ہے۔ لہٰذا میں آپ حضرات کی دعاؤں کا محتاج ہوں کہ میں بات بھی صحیح بیان کر سکوں اور اس کے لئے میری زبان سے الفاظ بھی صحیح نکلیں اور میں مناسب ترین پیرایہ بیان میں یہ مسئلہ آپ حضرات کے سامنے رکھ سکوں۔

ان مسائل پر گفتگو کرتے وقت گویا ہم یہ فرض (Suppose) کر رہے ہیں کہ ابتدائی مراحل کسی معاشرہ میں مکمل ہو چکے ہیں یعنی خالص اسلام کی دعوت پر ایک تحریک اٹھی۔ اس کو اس معاشرہ میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسے Response ملا۔ لوگوں نے شعوری طور پر اس دعوت کو قبول کیا۔ پھر وہ منظم ہوئے اور سمع و طاعت والی ایک تنظیم کا نظام قائم ہو گیا۔ پھر یہ کہ ان کی تعداد بھی اتنی معتدبہ ہو گئی کہ وہ تنظیم اب رائج نظام کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ پھر یہ کہ تنظیم کے کارکنوں کی تربیت بھی ایسی ہو چکی ہے کہ ان کے انفرادی کردار و اخلاق اور ان کی سیرت کے اعتبار سے ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ ان کے متعلق یہ حسنِ ظن موجود ہے کہ وہ فی الواقع اپنی انفرادی زندگی میں اپنے امکان بھر اسلام عملاً نافذ کر چکے ہیں اور انہوں نے تزکیہ کے مراحل بھی طے کر لئے ہیں اور ان کے دل راہ حق میں قربانیاں دینے کے لئے بیتاب ہیں..... تو یہ ہیں مفروضات (Presuppositions) جن پر ہم آگے گفتگو کریں گے اس لئے کہ آخری مرحلہ کی بات ہو رہی ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھئے کہ یہ اس مرحلہ کی بات ہے جو کسی انقلابی عمل کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ یہ آج کا مسئلہ نہیں ہے یہ فوری طور پر عمل کرنے والی بات نہیں ہے۔ ہم اس آخری مرحلہ کو صرف علمی طور پر سمجھ رہے

ہیں۔

وہ مسئلہ کیا ہے؟ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اگر ہمارا سابقہ ایسے حالات سے ہو کہ ایک مسلمان معاشرہ میں جو ایمان اور عمل دونوں کے اعتبارات سے سخت مضمحل ہو چکا ہے نیز جس میں حکومت کرنے والے بھی مسلمان ہیں۔ خواہ وہ بادشاہ ہوں، جیسے سعودی عرب اور دوسرے عرب ممالک میں ہیں، چاہے وہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز ہوں جیسے ہمارے ملک اور ترکی و انڈونیشیا میں ہیں؛ خواہ وہ جمہور کے منتخب نمائندے ہوں جیسے بہت سے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں..... بہرحال کچھ بھی ہو مسلمانوں کا معاشرہ ہے اور حکمران بھی مسلمان ہیں۔ ان کی تکفیر نہیں کی گئی ہے۔ اپنی نجی زندگیوں میں وہ کچھ بھی ہوں۔ فاسق و فاجر ہوں، یا نمازی اور روزہ دار ہوں، دونوں صورتوں میں وہ مسلمان ہیں..... لیکن اس معاشرہ میں اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو اس نظام کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کر صحیح و حقیقی اسلامی نظام کے قیام و نفاذ اور رواج کے لئے آخری اقدام کی صورت کیا ہو گیا یا بالفاظ دیگر کیا ہو سکتی ہے جو مسلح تصادم کا بدل (Alternative) بن سکے!!

ایک اسلامی تحریک کے اوصاف: آگے بڑھنے سے قبل بات کی تفہیم کے لئے میں ایک بار پھر ایسی تحریک کے اوصاف گنوا دیتا ہوں جو ٹھیٹھ اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کسی معاشرہ میں اٹھی ہو۔ وہ تحریک کسی فرقہ واریت کی بنیاد پر نہ اٹھی ہو۔ وہ محض رائج الوقت نظام کی کسی جزوی اصلاح کے لئے نہ اٹھی ہو۔ وہ صرف کسی انتخابی عمل کے ذریعہ اس نظام کو چلانے والے ہاتھوں کو بدلنے کے لئے میدان میں نہ آئی ہو۔ بلکہ اس جماعت کا مقصد خالص اسلامی انقلاب برپا کرنا ہو یعنی معاشرہ میں علمی و عملی دونوں اعتبارات سے توحید کے نفاذ و انعقاد کی جدوجہد ہی اس کا مقصود و مطلوب ہو..... پھر یہ کہ ایک معتدبہ تعداد میں لوگوں نے اسے شعوری طور پر قبول کیا ہو۔ پھر یہ کہ وہ منظم ہو چکے ہوں اور منظم بھی اس درجہ میں کہ "وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا" کی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ پھر دعوت و تبلیغ کے دوران انہوں نے صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا ہو۔ وہ کبھی مشتعل نہ ہوئے ہوں۔ انہوں نے کبھی بھی گالی کا جواب گالی سے نہ دیا ہو..... یعنی وہ ان مراحل سے بڑی حد تک گذر چکے ہوں، جن کا مطالعہ صبر محض کے عنوان کے تحت ہم سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مدنی دور کے حالات کے ضمن میں کر چکے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے سختیاں جھیلیں ہیں، استہزا اور تمسخر برداشت کیا ہے۔ ذہنی و جسمانی تشدد جھیلا ہے۔ معاشرہ نے اہل ایمان کا بائیکاٹ کیا ہے۔ شعب بنی ہاشم کی تین سالہ جاں گسل محصوری سے سابقہ پیش آیا ہے۔ ایمان لانے والے صنید و صالح نوجوانوں کو ان کے خاندان والوں نے گھروں سے نکالا ہے۔ ان پر معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کیا گیا ہے۔ لیکن وہ ان

سب کو جھیلتے اور برداشت کرتے ہوئے توحید کا علم ہاتھ میں لئے توحیدی انقلاب اور توحیدی نظام قائم کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں..... کسی ادنیٰ درجہ میں اس جماعت کے وابستگان میں بھی ان باتوں کی کوئی جھلک نظر آ رہی ہو۔

نقطۂ توحید کی تفسیر: زبان پر نظام توحید جس کی ایک تعبیر اسلامی انقلاب ہے بے ساختہ آ گیا۔ لیکن اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں توحید کے عملی تقاضوں کو بیان کروں اور یہ بتاؤں کہ توحید انسان کی اجتماعی زندگی کے جملہ شعبوں اور گوشوں کو کس طرح اپنی گرفت میں لیتی ہے۔ اس پر میں تفصیل سے مختلف مواقع پر گفتگو بھی کر چکا ہوں اور "اسلام کا انقلابی منشور" کے عنوان سے تنظیم اسلامی کی جانب سے آٹھ صفحات کا پمفلٹ بھی لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو کر بعض قابل لحاظ و ذکر بڑے شہروں میں تقسیم ہو چکا ہے۔ مختصر طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توحید کی بنیاد پر جو نظام قائم ہوتا ہے صرف اور صرف وہی نظام عدل و قسط کہلانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ یہ نظام توحید ہی سماجی سطح پر کامل انسانی مساوات قائم کرتا ہے۔ نسل، رنگ، زبان، پیشہ، اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی بلند و اعلیٰ ہوتا ہے نہ کوئی کمتر و پست..... پھر مرد و عورت کے منصفانہ طور پر حقوق اور فرائض کو متعین کرتا ہے..... معاشی سطح پر یہ نظام ملک کے ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات زندگی کی کفالت کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیتا ہے۔ آجر و مستاجر (مزدور و کارخانہ دار) کے درمیان عدل و انصاف اور اخوت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ کرتا ہے..... اس نظام توحید میں سیاسی سطح پر حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہوتی ہے..... ملک کی پارلیمنٹ یا اسمبلی اُمرھم شوریٰ بینھم کے اصول پر شریعت کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے دیگر انتظامی و فلاحی امور کے لئے قانون سازی کی مجاز ہوتی ہے۔ لیکن وہ اللہ و رسول یعنی کتاب و سنت میں بیان کردہ حدود و تعزیرات میں ایک شوشہ کے برابر بھی تغیر و تبدل کی مجاز نہیں ہوتی..... یہ بات بطور جملہ ہائے معترضہ بیان ہو گئی۔ اب آیئے اصل موضوع کی طرف.....

اقدام کا مرحلہ: ہم اس مفروضے کو سامنے رکھ کر گفتگو کر رہے تھے کہ ایک اسلامی تحریک مختلف مراحل سے گذر کر اقدام کے مرحلہ تک آ گئی تو بحالات موجودہ اقدام کی صورت کیا ہو گی..... ظاہر ہے کہ اقدام کے بغیر نظام نہیں بدلے گا۔ بیٹھے رہیں گے تو وہ نظام خود بخود تبدیل نہیں ہو گا۔ اسی موقع پر یہ بات بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ محض وعظ و نصیحت سے بھی ہرگز ہرگز کوئی نظام تبدیل نہیں ہوتا..... البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس فاسد نظام میں چند نیک، صالح باکردار اور متقی لوگوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے لئے اقدام ناگزیر ہے۔ اس کے بغیر انقلاب نہیں آتا..... تو ہمارے دور میں اگر کوئی اسلامی تحریک ابتدائی مراحل سے گذر کر اقدام کے مرحلہ تک پہنچ

جائے تو ایک مسلمان معاشرہ اور مسلمان حکمرانوں کے خلاف اقدام کی نوعیت اور شکل کیا ہو گی!!..... یہ ہے اصل سوال جس پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہنچنے کے لئے آج کی گفتگو ہو رہی ہے۔

ایک غلط بات کا ازالہ: اس ضمن میں سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بعض حضرات کے ذہنوں میں جو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ کسی مسلمان حکمران کے خلاف مسلح اقدام کی شریعت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔ اگرچہ ہمارے یہاں یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے لیکن یہ متفق علیہ بات نہیں ہے کہ کسی بھی حالت اور کسی بھی صورت میں کسی مسلمان حکمران کے خلاف خروج نہیں ہو سکتا یا بغاوت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ اگر آپ اس کو تسلیم کر لیں گے تو اس کے معنی تو یہ ہوں گے کہ فساق و فجار کی حکومت کبھی ختم نہیں ہو گی۔ جو فاسق و فاجر ایک بار مسلط ہو گیا تو پھر اس کا یہ تسلط دائمی ہو گا اور سوائے زبانی و کلامی نصیحت کرنے یا خاموش رہنے کے کوئی عملی اقدام کرنے کا حق و اختیار باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ اکثر حالات میں تو زبان پر بھی پہرے بٹھا دیئے جائیں گے کہ تنقید تو کجا دل سوزی ہمدردی اور دمسازی سے نصیحت کرنے پر بھی زبان بندی کر دی جائے گی۔ ایسی صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تسلط باقی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہو گا۔

حضرت حسین کا اقدام اسی سلسلہ میں، میں یہ بھی عرض کر دوں کہ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اقدام فرمایا اور صرف حضرت حسینؓ نے نہیں فرمایا بلکہ حضرت عبداللہ بن زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اقدام فرمایا۔ تو ہم ایک لمحہ کے لئے بھی یہ باور نہیں کر سکتے کہ ان حضرات گرامیؓ کا اقدام خلاف شریعت تھا یا وہ کوئی ناجائز کام کر رہے تھے۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اجتہادی خطاء: میں یہ بات بہت پہلے تفصیل سے کہہ چکا ہوں..... سانحہ کربلا کے نام سے میری تقریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف رائے کی گنجائش ہے۔ ہم یہ کہیں گے کہ یہ سہادی مسئلہ تھا۔ اگر حضرت حسین ابن علی اور حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اقدامات کئے تو یہ ان حضرات کی اجتہادی غلطی تو ہو سکتی ہے۔ اس میں خطاء کا امکان بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے ناجائز کام یا ہوس اقتدار ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا شائبہ بھی دل میں آ گیا تو ندامت خداوندی میں لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ یہی معاملہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی رائے کے متعلق کہا جائے گا کہ اگر انہوں نے ان حضرات کو اقدام کرنے سے روکا اور یزید کی بیعت کر لی تو یہ ان کی اجتہادی رائے ہے جس میں خطاء کا امکان ہے۔ لیکن اس کو حرام قرار نہیں دیا جا سکتا۔ دو انتہاؤں کے درمیان میں ہمارے سلف و خلف کے علمائے ربانی کی رائے یہی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ گنجائش تو موجود ہے۔ اس لئے کہ اگر دین کے اندر

گنجائش کوئی نہ ہو تو کیا حضرت حسین ابن علی اور عبداللہ ابن زبیر اور عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین کوئی ایسا کام کر سکتے تھے کہ جس کی دین میں قطعی ممانعت ہو!

گنجائش تو ہے جب ہی تو ان دونوں بزرگوں نے اقدامات کئے۔ البتہ یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اس اقدام کے لئے موقع و محل بھی مناسب ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق خاص اجتہاد سے ہے جس میں خطاء و صواب دونوں کا برابر امکان موجود رہتا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس لئے میں عرض کروں گا کہ اس بات کو ذہن سے نکال دیجئے کہ مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت سرے سے ہو ہی نہیں سکتی۔

حنفی مسلک: میں تو اس سے بھی آگے کی بات عرض کروں گا کہ ہمارے اس ملک میں بسنے والے سنی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت حنفی المسلک ہے..... امام ابو حنیفہ رحم اللہ کا موقف یہی ہے کہ اقدام ہو سکتا ہے اور خروج ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کے لئے شرائط بڑی کڑی ہیں' اس میں کوئی شبہ نہیں..... امام صاحب رحمہ اللہ کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت نفس ذکیہ رحمتہ اللہ علیہ کی تائید بھی کی تھی اور ان کو مالی اعانت بھی فراہم کی تھی جنہوں نے بنو عباس کی حکومت کے خلاف خروج کیا تھا۔ البتہ امام صاحب نور اللہ مرقدہ بنفس نفیس میدان میں نہیں آئے تھے۔ تاریخ کی تمام مستند کتابوں میں ان باتوں کا ثبوت موجود ہے..... میں جو بات واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ دینی اور شرعی اعتبار سے ایسا معاملہ نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی' کسی صورت میں بھی کسی فاسق و فاجر حکمران کے خلاف خروج یا بغاوت نہ کی جا سکے۔ البتہ فقہائے احناف نے اس کے لئے شرطیں بڑی کڑی لگائی ہیں۔

کڑی شرائط کیا ہیں: ایک شرط تو یہ ہے کہ حکمرانوں کی طرف سے کھلم کھلا اور برملا کسی ایسی بات کا ظہور ہو رہا ہو جو خلافِ اسلام ہے۔ مثلاً اپنے گھر میں بیٹھ کر کوئی شخص شراب پی رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ شراب نوشی کی ترویج کر رہا ہو' لوگوں کو اس کے استعمال کی ترغیب و تشویش دے رہا ہو تو معاملہ مختلف ہو جائے گا۔ ایسے حکمران کو معزول کرنے کے لئے قوت فراہم کرنا اور خروج کرنا بالکل جائز اقدام ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس نظام کو بدلنے کے لئے جو لوگ انھیں ان کی طاقت اور ان کے اثرات اتنے زیادہ ہو چکے ہوں کہ وہ یقین رکھتے ہوں کہ ہم تبدیلی برپا کر دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تھوڑی سی طاقت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیں۔ جس کا نتیجہ بدامنی ہو گی اور وہ لوگ ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ بلکہ صورت یہ ہونی چاہئے کہ بحالات ظاہر یہ امید واثق ہو کہ ہم نظام کو بدل سکتے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ اپنی جانوں کا ہدیہ پیش کر دیں اور نظام جوں کا توں قائم رہے..... تو یہ ہے اس مسئلہ کی خالص دینی اور شرعی حیثیت۔

ایک قابل لحاظ نکتہ: لیکن اگلی بات ہے جو میرے نزدیک اہم ترین ہے اور وہ یہ ہے کہ بالفعل یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ اب خروج و بغاوت کا امکان موجود ہے ہی نہیں۔ چونکہ صورت حال یہ بن چکی ہے کہ اس زمانہ میں 'STANDING ARMIES' (باقاعدہ تنخواہ دار فوجیں) نہیں ہوتی تھیں۔ اگر ہوتی بھی تھیں تو بہت کم..... جبکہ آج کل قریباً ہر حکومت کے پاس لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ اور منظم فوجیں ہوتی ہیں۔ اس دور میں یہ صورت موجود نہیں تھی۔ ثانیاً اس دور میں جس نوع کا اسلحہ فوجوں کے پاس ہوتا تھا قریباً اسی نوع کا عوام کے پاس بھی ہوتا تھا۔ اس میں مقدار کا فرق تو ہو سکتا ہے۔ لیکن وہی تلواریں' وہی نیزے' وہی تیر' وہی ڈھالیں فوج کے پاس ہیں تو عوام کے پاس بھی ہیں۔ تو اس زمانہ میں نسبت و تناسب کا کوئی نہ کوئی ایک معاملہ موجود تھا۔ لیکن اب جو تمدن کا ارتقا ہوا ہے تو یہ صورت باقی نہیں رہی ہے۔ حکومت کے وسائل' اس کی طاقت' اس کی فوجیں' ان کے اسلحہ کے معاملہ کی نوعیت بالکل بدل چکی ہے۔ اب سرے سے کوئی نسبت و تناسب موجود ہی نہیں ہے۔ حکومت کی افواج نہ معلوم کس کس نوعیت کے اعلیٰ سے اعلیٰ اسلحہ سے لیس ہیں اور اس طرح حکومت ایک قوی ترین ادارہ بن چکی ہے۔ جبکہ عوام قریباً بالکل نہتے ہیں۔ تو یہ فرق و تفاوت اتنا عظیم ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا..... لہٰذا خروج اور بغاوت بحالات موجودہ تقریباً خارج از بحث ہو چکی ہے۔ شرعی اعتبار سے نہیں' حالات کے اعتبار سے اب اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک اہم سوال: ان تمام تنقیحات کے بعد ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ اس چھٹے مرحلہ کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا! اس کا بدل (ALTERNATE) کیا ہو گا..... ؟ اس سوال کے براہ راست جواب سے قبل ضروری ہے کہ دو اہم امور کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

تمدنی ارتقا سے پیدا شدہ دو اہم تبدیلیاں

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ تمدنی ارتقا نے یہ شکل پیدا کی ہے کہ حکومت کے پاس قوت اور طاقت بے انتہا ہوتی ہے۔ فوج اس کی پشت پناہ ہوتی ہے..... اسی موقع پر یہ بات بھی پیش نظر رکھئے کہ بات پاکستان کی نہیں ہو رہی بلکہ علمی اور اصولی نقطہ نظر سے ہو رہی ہے۔ آخر یہ مسئلہ شام میں بھی تو درپیش ہے۔ شام میں اخوان المسلمون نے اسلام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی ہے لیکن مقابلہ کس سے ہے! حافظ الاسد کی حکومت سے' جس کے پاس فوج ہے جو بے انتہا جدید ترین اسلحہ سے لیس ہے۔ جس کے پاس ذرائع و وسائل موجود ہیں۔ اور جس کی پشت پر روس جیسی سپر پاور موجود ہے۔ لہٰذا اخوان المسلمون کچلے جا رہے ہیں اور ان کی مسلح جدوجہد ختم ہو چکی ہے۔ دم توڑ چکی ہے..... پھر آپ خود سوچئے کہ اسی طرح کا مسئلہ افغانستان میں ہو رہا ہے کہ نہیں! کارمل بظاہر تو مسلمان ہے۔ میں نے آج تک تو نہیں سنا کہ اس کی تکفیر کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ جو افغانی فوج ہے' وہ چاہے ہوتے ہوتے سکڑ گئی ہو لیکن وہ سب کے سب بہرحال مسلمان تھے اور ہیں۔ مسلمان ماؤں

کا دودھ پیئے ہوئے ہیں۔ لیکن چونکہ فوج کا جدید تصور یہ ہے کہ جو شخص یا گروہ اقتدار میں ہو یا کسی طرح اقتدار میں آجائے تو فوج اس کا حکم مانے اس کو تحفظ (Protection) دے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ مجھے تو دکھ ہوتا ہے جب خبریں آتی ہیں کہ اتنے کارمل فوجی مجاہدین کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے جبکہ میں جانتا ہوں کہ مجاہدین 'اسلام کے لئے' حریت کے لئے اور خدانا آشنا بلکہ خدا دشمن روسی جارحیت کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ اس لحاظ سے ان کی کامیابی پر خوشی ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس میں دکھ کا یہ پہلو موجود ہے کہ وہ ہلاک ہونے والے بھی تو مسلمان ہیں۔ وہ ایک حکومت کے حکم کے تحت جنگ کر رہے ہیں..... دونوں طرف سے مسلمانوں ہی کا خون بہہ رہا ہے۔ روسی فوج کے لوگ تو کارمل فوج کے مقابلہ میں کم ہی مرے ہوں گے۔ دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ہاتھوں مسلمان ہی ہلاک ہو رہے ہیں۔ لہٰذا یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ نہیں' کہ آیا ایک فاجر و فاسق حکومت کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں! اگر مسئلہ یہ ہوتا کہ کسی طور پر بھی خروج اور مسلح بغاوت جائز نہیں تو آج ہمارے جو افغانی بھائی کارمل فوجوں سے نبرد آزما ہیں وہ "مجاہدین" کہلانے کے بجائے باغی کہلاتے۔ لہٰذا ہر ملک کے علیحدہ علیحدہ مسائل ہیں اس صورت کے پیش نظر ہمیں پاکستان کے حالات کو ایک طرف رکھ کر اصولی طور پر بات سمجھنی ہوگی..... اب سابقہ سلسلہ کلام سے تعلق جوڑیئے تو میں عرض کر رہا تھا کہ جہاں تمدنی ارتقاء نے حکومت کے ہاتھ میں بے پناہ قوت فوج کی شکل میں دے دی ہے وہاں اسی تمدنی ارتقاء کی بدولت دو اہم تبدیلیاں اور بھی آئی ہیں۔ دینی مزاج کے ہمارے اکثر لوگ ان تبدیلیوں سے واقف نہیں ہیں چنانچہ جب میں اسلامی انقلاب کے چھٹے مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کی بات کرتا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں اور میری تنظیم پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں ہے تو وہ چونک جاتے ہیں کہ ڈاکٹر اسرار تو مسلح بغاوت کی بات کر رہا ہے اور مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوانا چاہتا ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں ہے۔ جب سیرت مطہرہ صلی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے فلسفہ انقلاب اخذ (Derive) کیا جائے گا اور حضورؐ کی سیرت مبارکہ کے معروضی مطالعہ سے انقلاب محمدیؐ کے مراحل و مدارج کے تعین کی کوشش کی جائے گی تو لامحالہ چھٹے اور آخری مرحلہ کے طور پر مسلح تصادم کا ذکر آئے گا..... میں نے اس موضوع پر جب بھی کہیں تقریر کی ہے تو ان متبادل طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے جو تمدن کے موجودہ ارتقاء نے دنیا کو دیئے ہیں' جن پر میں آج اظہار خیال کر رہا ہوں۔

ریاست اور حکومت کا فرق: انسانی تمدن کے بتدریج ارتقاء کے نتیجہ میں سب سے اہم تبدیلی یہ رونما ہوئی ہے کہ آج کے دور میں "ریاست" اور "حکومت" دو علیحدہ علیحدہ چیزیں تسلیم کی جاتی ہیں جبکہ آج سے دو سو سال قبل یہ صورت حال موجود نہیں تھی۔ حکومت ہی کو ہم جانتے تھے۔ ریاست' کس چڑیا کا نام ہے! اسے ہم جانتے ہی نہیں تھے۔ ادھر کوئی شخص حکومت کے خلاف کھڑا

ہوا ادھر اسے فوراً باغی گردان کر گردن زنی قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ صورت حال اس دور میں بدل چکی ہے..... اب یہ معاملہ ختم ہو چکا ہے..... انسانی فکر اور انسانی تمدن کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کے تحت اب یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ "ریاست" ایک بالکل علیحدہ شے ہے اور حکومت صرف ریاست کے معاملات کو چلانے والا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ کسی ملک کے رہنے والے دستوری اور آئنی طور پر درحقیقت "ریاست" کے وفادار ہوتے ہیں حکومت کے نہیں ہوتے۔ حکومت کی اطاعت تو وہ کرتے ہیں لیکن دراصل جس شے کو وفاداری کہا جاتا ہے وہ "ریاست" کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے۔ پاکستان ایک ریاست ہے۔ اس ریاست کو چلانے والی ایک حکومت ہے جو اس ریاست کا ایک انتظامی ادارہ ہے۔ یہ حکومت بدلتی بھی رہتی ہے۔ آج کسی کی ہے تو کل اور کی ہے۔ کبھی سول (CIVIL) کی ہے تو کبھی ملٹری (MILITARY) کی کبھی ایوب صاحب کی تھی کبھی یحییٰ کی۔ پھر بھٹو صاحب آئے۔ ان کے بعد سے قریباً ساڑھے سات سال سے مسند اقتدار پر جنرل ضیاء الحق صاحب متمکن ہیں۔ پس حکومت تو آنی جانی شے ہے۔ جس شے کو دوام ہے، جو چیز تسلسل کی حامل ہے، وہ تو درحقیقت ریاست ہے..... لہٰذا کسی بھی ملک کے رہنے والوں کی اصل وفاداری ریاست سے ہوتی ہے۔ حکومت سے نہیں ہوتی۔

تمدن کے ارتقاء اور فکر انسانی کی وسعت کے نتیجہ میں دوسری اہم تبدیلی یہ آئی ہے کہ آج پوری دنیا میں یہ بات مسلم سمجھی جاتی ہے کہ کسی حکومت کو بدلنے کا حق اس ملک کے رہنے والوں کو حاصل ہے..... کوئی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی مستقل قسم کی حکومت ہے۔ جو بھی کہے گا یہی کہے گا کہ یہ وقتی اور عارضی انتظام ہے۔ حالات خراب ہو گئے تھے۔ انتشار ہو گیا تھا۔ خانہ جنگی کا اندیشہ لاحق تھا۔ لہٰذا فساد کو روکنے کے لئے یہ فوری نوع کا اقدام بطور فوری علاج کیا گیا ہے۔ وقتی طور پر حکومت کے انتظام کو فوج نے سنبھالا ہے۔ ہمارا اس کو مستقل قائم رکھنے کا ارادہ نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے کوئی بھی ایسا حکمران جو جمہوری طریقہ سے برسر اقتدار آیا ہو یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اب اس کی یا اس کے خاندان کی اس ملک پر مستقل حکومت رہے گی۔ البتہ جہاں ملوکیت اور بادشاہت (MONARCHY) قائم ہے وہاں معاملہ تا حال سابق انداز پر چل رہا ہے کہ وہاں خاندانی حکومتیں قائم ہیں۔ وہاں ریاست و حکومت کا کوئی علیحدہ تصور موجود نہیں ہے۔ وہاں کوئی سیاسی جماعت بنانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ جہاں جماعت بنی اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ صاحب کو ہٹانے کی کوئی کوشش پیش نظر ہے۔ تو وہ نظام چند ممالک میں تا ہنوز چل رہا ہے اور "اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو" کے مصداق فی الحال ان کا معاملہ ایک طرف رکھئے۔ البتہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ زیادہ دیر چلنے والا انتظام نہیں ہے اس کے گرد جو دیواریں ہیں وہ بہت بوسیدہ ہو چکی ہیں اور گرا ہی چاہتی ہیں اب کوئی دیر کی بات ہے اس کو ختم ہونا ہی ہونا ہے اور وہ بات ہو کر رہے

گی جو اپنے زوال کے وقت شاہ فاروق نے کہی تھی کہ "دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے چار تاش کے ہوں گے اور ایک انگلستان کا ہوگا"..... اس لئے کہ انگریزوں نے بادشاہت کو ایک نمائشی اور آرائشی علامت (Decoration Piece) کی حیثیت سے اپنے یہاں سجا کر رکھا ہوا ہے۔ باقی اس کے سوا اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چونکہ روایت پرستی اس قوم کے مزاج میں رچی بسی ہے لہٰذا وہ روایتی طور پر اس کو نباہ رہے ہیں ورنہ ساری دنیا جانتی ہے کہ وہاں اصل اقتدار و اختیار پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔

اس نقطہ نظر سے یہ بات جان لیجئے کہ ساری دنیا مانتی ہے کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا یہ مسلم حق ہے کہ وہ آئینی و دستوری طور پر حکومت بدل سکتے ہیں۔ مدت سے قبل نئے انتخابات کا مطالبہ لے کر کھڑے ہو سکتے ہیں..... یہ بالکل استثنائی صورت حال ہے کہ ہنگامی حالات سے فائدہ اٹھا کر کوئی جنرل بحیثیت مارشل لاء چیف ایڈمنسٹریٹر اقتدار پر قبضہ کر لے اور رائے دہندگی کے حق کو معطل (Suspend) کر دے۔ اب میں اس بحث میں نہیں جاؤں گا کہ یہ تعطل (Suspension) جائز ہے کہ ناجائز ہے۔ حالات ایسے ہو سکتے ہیں۔ آپ کو علم ہو گا کہ ہر ملک کے دستور (Constitution) میں یہ گنجائش (Provision) رکھی جاتی ہے کہ اگر کسی وقت ملک کی بقاء اور اس کی سالمیت کو کوئی شدید خطرہ لاحق ہو جائے تو ہنگامی حالات کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ عوام کے حقوق عارضی طور پر معطل اور ساقط ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس امکان کو خارج از بحث نہیں کیا جا سکتا..... یہ بالکل علیحدہ مسئلہ ہے کہ آیا واقعی ہنگامی حالات تھے یا نہیں! صورت حال خراب تھی یا نہیں! کیا اب تک وہ صورت حال برقرار ہے یا اصلاح پذیر ہو چکی ہے..... ؟ یہ جداگانہ بحث ہے۔ البتہ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہنگامی حالات اور مارشل لاء ایک عارضی انتظام کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی کوئی مستقل نوعیت کسی بھی متمدن ملک میں آج تک تسلیم نہیں کی گئی ہے..... بلکہ ایسے حالات میں حکمرانوں سے یہ توقعات وابستہ کی جاتی ہیں کہ وہ خراب حالات پر جلد از جلد قابو پا کر دستور کے مطابق ملک میں صحت مندانہ انتخابات کرا کے عوام کے نمائندوں کو اقتدار سونپ دیا جائے.....

یقیناً آپ کو یہ بات معلوم ہو گی کہ دنیا میں اس وقت سب سے زیادہ قابل تسلیم (Accept-able) بات یہی سمجھی جاتی ہے کہ ملک کے رہنے والوں کو سیاسی جماعتیں (Political Parties) بنانے کا حق حاصل ہے اور ہر پارٹی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ موجودا لوقت حکومت کو ہٹانے کے لئے اپنی انتخابی مہم چلائے۔ اس پر دل کھول کر اور تلخ و تند تنقیدیں کرے۔ رائے عامہ کو اپنی پارٹی کے حق میں ہموار کرے تاکہ حکومت اس پارٹی کی قائم ہو سکے۔ زیادہ سے زیادہ پابندی لگائی جاتی ہے کہ سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی میں شامل اس کی انتخابی جدوجہد میں شرکت نہیں کر

سکتے اور انتخاب میں بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ وہ ریاست کے ملازم اور کارکن ہیں۔ ریاست کی طرف سے ان کو کچھ اختیارات ملے ہوئے ہیں اگر وہ کسی سیاسی پارٹی سے عملاً وابستہ ہوں گے تو ان کے ہاتھ میں جو اختیارات ہیں ان کے غلط استعمال کا اندیشہ ہے..... باقی رہا ووٹ دینے کا معاملہ! تو یہ حق ان کا برقرار رہے گا۔ اس پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ عوام کی رائے سے حکومت میں تبدیلی ہوگی اور اس معاملہ میں سرکاری ملازمین ہی نہیں بلکہ فوجیوں کو بھی حق ہوگا کہ اپنی پسندیدہ پارٹی کو ووٹ دیں۔

اس پہلو سے یہ بات جان لیجئے کہ تمدن کا جوارتقا ہوا ہے' اس نے یہ متبادل طریقے (Alternate Procedure) عطا کئے ہیں جبکہ اس سے پہلے یہ صورت نہیں تھی۔ ریاست اور حکومت کا تصور گڈمڈ تھا۔ اور حکومت کو ہی ریاست کا مقام بھی حاصل تھا۔ نیز حکومت کو بدلنے کی کوشش کو بغاوت سمجھا جاتا تھا..... جبکہ اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ ریاست اور حکومت دو مختلف تصورات ہیں اور کسی بھی ملک کے باشندوں کو آئینی طور پر یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کو بدل دیں۔

خلافت راشدہ کے نظام کی نوعیت..... میں آج صبح جب اس تقریر کے متعلق سوچ رہا تھا تو خلافت راشدہ کا نظام بھی زیر غور آیا۔ چونکہ وہ نظام حکومت ہمارے نزدیک سب سے زیادہ محترم ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے والا نظام حکومت خلافت راشدہ ہی کا تو ہے۔ لیکن اس احترام و توقیر کے علی الرغم ایک بات جان لیجئے کہ اس کے ساتھ دو محدودیتیں (Limitations) موجود تھیں..... ایک تو یہ اس وقت بنیادی طور پر عرب میں ایک قبائلی (Tribal) سوسائٹی قائم تھی۔ لہٰذا جہاں ایک قبائلی نظام پہلے سے موجود ہے اس کے اندر اگر صرف سرداران قبائل (Chiefs of Tribes) سے مشورہ کر لیا جائے' ان کی آراء کو معلوم کر لیا جائے تو گویا ہر قبیلہ کے فرد سے مشورہ کا حق ادا ہو گیا۔ دوسری یہ کہ سرداران کی حیثیت اپنے قبیلہ کے نمائندہ کی ہوتی تھی۔ لہٰذا وہاں فہرست رائے دہندگان کی تیاری' بیلٹ اور انتخاب کے کھکھیڑ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں قبائل کے سردار اور بڑے بڑے خاندانوں کے سربراہ ارباب حل و عقد کہلاتے تھے۔ کسی معاملہ میں ان سے مشورہ ہو گیا تو گویا "امرھم شوریٰ بینھم" کا تقاضہ پورا ہو گیا۔ جبکہ موجودہ دور میں یہ بات نہیں چل سکتی۔ آپ نے دیکھا کہ اس دور کے تقاضہ کے تحت مارشل لاء چیف ایڈمنسٹریٹر جیسے مطلق العنان کو بھی ریفرنڈم کا ڈرامہ کھیلنا پڑا۔ اس قسم کی کسی صورت حال کا ثبوت آپ کو خلفائے راشدین کے دور میں تو نہیں ملے گا۔ لہٰذا یوں کہنا کہ اس طرز کا سیاسی نظام جو خلافت راشدہ میں قائم تھا' جوں کا توں اس دور میں چل سکتا ہے۔ ایک مغالطہ ہے..... اس میں حالات کی تبدیلی کے پیش نظر ایک ایسا نظام بنانے پر

غور کرنا ہو گا جس میں اصول تو ختم نہ ہوں 'اصول وہی رہیں لیکن ہمیں تمدن کے ارتقا کے ساتھ طریق کار کو ہم آہنگ کرنا ہو گا۔

ایک قابل غور بات: حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف جب ایک تحریک اٹھی..... اگرچہ میرے نزدیک وہ یہودی سازش تھی۔ شروع ہی سے اس کے عزائم مجرمانہ تھے 'اس کے اندر نیک نیتی کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی نظام حکومت میں جہاں بدنیتی کے ساتھ یہ معاملہ ہو گیا' وہاں نیک نیتی کے ساتھ بھی تو یہ معاملہ ہو سکتا ہے۔ اس امکان کو آپ خارج از بحث نہیں کر سکتے۔ بالکل نیک نیتی کے ساتھ بھی کسی ملک میں ایسی تحریک اٹھ سکتی ہے کہ موجودہ حکمران ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ انہیں معزول ہونا چاہئے اور ان کی جگہ نئی قیادت کا انتخاب ہونا چاہئے..... اس وقت تک ہمارے یہاں اس مقصد کے لئے کوئی 'Channels' موجود نہیں تھے۔ کوئی راستہ نہیں تھا کہ جن کے ذریعہ سے ایسا اختلاف رائے سامنے آ سکتا۔ درحقیقت تمدنی ارتقا نے جو متبادل راستے دیئے ہیں انہی کے ذریعہ اختلاف رائے بھی سامنے آتا ہے اور صحت مند انداز میں وہ اختلاف حل (Resolve) بھی ہو سکتا ہے..... چنانچہ تمدنی اور فکری ارتقاء نے اختلاف کے اظہار اور ان کو حل کرنے کے جو طریقے اور راستے (Chan-nels) کھول دیئے ہیں اب ہمیں انہی کو سامنے رکھ کر اسلامی اصولوں کے مطابق اپنے لئے کوئی راہ معین کرنی ہو گی۔

بنیادی انسانی حقوق: تمدنی ارتقاء نے اس بات کو بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق قرار دیا ہے کہ ایک شخص اپنی جماعت بنائے اور لوگوں کو اپنی بات کا قائل کرے۔ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنائے۔ اور وہ یہ کام کھلم کھلا اور برملا کرے یہ اس کا آئینی حق ہے۔

——— زیر زمین جانے کی اسے ضرورت نہیں ہے۔ پرامن طریقہ سے ہر پارٹی کو برسر اقتدار پارٹی کے خلاف مہم اور تحریک چلانے کا حق پوری دنیا میں اب تسلیم کیا جاتا ہے۔

ہمارے سوچنے کا کام..... ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم تمدنی ارتقاء اور اس انقلاب کو سامنے رکھیں جس نے یہ متبادل طریقے (Alternate Procedures) دنیا کو دیئے ہیں کہ آج یہ امکان موجود ہے کہ حزب اختلاف قائم ہو..... جب تک وہ پارٹی بغاوت نہیں کرتی 'اور پرامن طور طریقے اختیار کرتی ہے 'کوئی قانون اس کے خلاف نہیں جائے گا۔ وہ پارٹی تبلیغ کا حق رکھتی ہے۔ اپنے خیالات کی نشرواشاعت کا حق رکھتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیالات کو قبول کریں 'انہیں جمع کرنے اور منظم کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اسے اپنے طریق تنظیم کو اپنی صواب دید کے مطابق اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے سربراہ کو صدر کہے 'امیر کہے 'کوئی اور اصطلاح اختیار کرے اسے

حق ہے۔ جب تک یہ پارٹی بدامنی کی کوئی صورت پیدا نہ کرے' جب تک وہ فساد پیدا نہ کرے' خانہ جنگی کی صورت پیدا نہ کرے اس وقت تک اس کے وہ تمام حقوق مسلمہ ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے ہیں۔ ان میں سے کوئی حق بھی سلب نہیں کیا جاسکتا۔ الّا یہ کہ ہنگامی صورت حال یا مارشل لاء کا عارضی نظام کچھ عرصہ کے لئے ان کو معطل کر دے..... عارضی شے عارضی کے درجہ میں ہی رہے گی وہ تو ایک استثنائی حالت ہے میں نارمل حالات کی بات کر رہا ہوں جس میں یہ تمام حقوق مسلم ہیں۔ ان میں سے کسی حکومت کو کوئی حق سلب یا ساقط کرنے کا حق و اختیار حاصل نہیں ہے۔

حالات کا دیانت دارانہ تجزیہ..... اب اگر کسی ملک میں خالص اسلامی نظام برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنتی ہے۔ اگرچہ معاشرہ میں اسلامی شعائر کی پابندی مثلاً نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج کی اجازت ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ بھٹو صاحب کے دور میں بھی ان شعائر سے روکتا تو کوئی نہیں تھا۔ البتہ یہ فضا بڑی حد تک پیدا ہو گئی تھی کہ بھٹو صاحب کی پارٹی کے اکثر کارکن ان چیزوں کا مذاق اڑانے لگے تھے..... میں جنرل ضیاء الحق صاحب کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ آج ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے کہ جس میں ترغیب و تشویق کا عنصر کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ اب وہ بات نہیں رہی ہے کہ کسی نمازی پر فقرے چست کئے جائیں یا کوئی سرکاری افسر اس بات پر شرمائے کہ وہ اگر کسی فنکشن یا مجلس سے نماز کے لئے اٹھ کر جائے تو لوگ کیا کہیں گے! ماحول میں کچھ نہ کچھ تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہی سب کچھ ہے.....؟ ایک شخص کی رائے ہو سکتی ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے' بلکہ ہم نے اوپر کا غازہ مل دیا ہے' حقیقت کے اعتبار سے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ محض تصنع ہے..... اور حقیقت کے عدم وجود اور تصنع کے ہونے کے باعث عوام کے اندر اسلام سے بددلی پیدا ہو رہی ہے کہ ہمارے شب و روز تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ بلکہ بگاڑ میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے..... وہی سرمایہ دار کی حکومت ہے' جاگیردار اور زمیندار کی حکومت ہے' وہی رشوت کا لین دین ہو رہا ہے' دھڑلے سے ہو رہا ہے۔ بلکہ خود سربراہ مملکت کے بقول اس کے بہت بڑھ گئے ہیں۔ اسمگلنگ کا کاروبار کھلے بندوں ہو رہا ہے سود کا لین دین جاری ہے۔ منشیات کی اندرونی و بیرونی تجارت کھلے عام ہو رہی ہے۔ بلیک مارکیٹنگ کا دھندا مزید زوروں پر ہے۔ ڈاکہ' چوری' لوٹ مار' قتل و غارت کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اغوا اور عصمت دری کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں' علاقائی قومیتوں کا احساس مزید ابھر رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں جلد ہی یہ بہت سے خوفناک عفریتوں کا روپ نہ ڈھال لے..... استحصالی اور جابرانہ نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ تو ایک طرف حالات کی صحیح تصویر یہ ہے دوسری طرف اسلام آ رہا ہے۔ اسلام آ رہا ہے' کے فلک شگاف نعرے لگائے جا رہے ہیں' بلند بانگ دعوے کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے اور دس بارہ سال سے قبل کے معاشرہ کا تقابل کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ سرمو

کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے بلکہ بحیثیت مجموعی حالات روز بروز بدتر سے بدتر ہوتے چلے جارہے ہیں۔ بلکہ ہم نے اس معاشرے پر اوپر کا کچھ غازہ مل کر اور کچھ ظاہری ٹیپ ٹاپ کر کے اسے اسلامی معاشرہ' کہہ دیا ہے اور ساری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے۔ تو ان حالات میں ضروری ہے کہ کوئی کھڑا ہو اور وہ برملا یہ حق بات کہے کہ ہمیں اس دھوکے کا پردہ چاک کرنا ہے اور انقلابی طریق کار پر عمل کرتے ہوئے اس نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ صحیح و کامل اسلامی نظام قائم و نافذ کرنا ہے۔ ایسے شخص کا دینی فریضہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی دعوت دے' اس کے لئے وہ لوگوں کو جمع کرے' انہیں منظم کرے' ان کی تربیت کا انتظام کرے..... جب تک وہ اس موجود و برقرار 'Law & Order Situation' (امن عامہ کی صورت حال) کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتا۔ جب تک وہ زبان سے بغاوت کا حکم نہیں نکالتا..... اسے یہ کام کرنے کا آئینی و قانونی حق ہے۔ بلکہ یہ اس کے اپنے ایمان کے تقاضا ہے کہ ابتدائی مراحل کو طے کرنے کی سعی و جہد کرے اور انقلاب لانے کے لئے اقدام کرے۔ ان مراحل میں اولاً دعوت کا مرحلہ ہے۔ پھر لوگوں کی تنظیم ہے' پھر ان کی تربیت ہے۔ پھر اس دوران اس پر جو تکلیف آئے اسے جھیلنا ہے اس لئے کہ اسے اپنے اوپر اسلام قائم و نافذ کرنا ہے مثلاً ایک شخص کے کاروبار کی کافی وسیع و عریض بساط بچھی ہوئی تھی' لیکن وہ اگر آج سود کی آمیزش اور آلودگی سے پاک کرنے کی فکر کرتا ہے تو اس کے کاروبار کی بساط لپٹنی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر کسی شخص کے گھر میں رشوت کے ذریعے سے اللے تللے ہو رہے تھے' آج وہ طے کرتا ہے کہ میں اب رشوت نہیں لوں گا تو اس کے خاندان کو دونوں وقت سادہ ترین غذا بھی شاید بمشکل ملے۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنے ہی گھر میں صحیح صحیح شرعی پردہ نافذ کر دے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی میں نکو بن کر رہ جائے گا اور اس کے اپنے اعزا و اقارب اسے دیوانہ اور مجنوں کہنے لگیں گے۔ اس کا مقاطعہ ہو جائے گا۔ عوامی زبان میں اس کا حقہ پانی بند ہو جائے گا..... یہ سب تکلیفیں وہ جھیلے' انہیں برداشت کرے۔ ان میں سے کسی بھی مصیبت پر جوابی کارروائی کے متعلق نہ سوچے..... ، Retaliate نہ کرے۔ اس میں کہیں جذبات سے مغلوب نہ ہو' مشتعل نہ ہو' کسی کو گالی نہ دے۔ کوئی ایسا اقدام نہ کرے کہ جس سے امن کا معاملہ درہم برہم ہو۔ یہ ہے اس دور میں ایک سچے مسلمان کی حقیقی تربیت کی کسوٹیاں۔ آج کلمہ توحید ورسالت پڑھنے پر مار نہیں پڑے گی' مقاطعہ نہیں ہو گا' گھروں سے نکالا نہیں جائے گا۔ مجنوں اور دیوانہ نہیں کہا جائے گا۔ تمسخر اور استہزا نہیں ہو گا اور جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس دور میں اگر کوئی شخص ہزار دانے کی تسبیح لے کر سڑک پر کہیں بیٹھ جائے اور بلند آواز سے کلمہ ادا کرے "حق ہو' حق ہو" کے نعرے لگائے تو موجودہ معاشرہ ایسے شخص کی بڑی عزت و توقیر کرے گا۔ اسے پہنچا ہوا بزرگ سمجھے گا۔ اس کی خدمت اپنے لئے سعادت سمجھے گا۔ لیکن کوئی شخص کاروبار کو سود سے پاک

رکھے، انکم ٹیکس کی چوری نہ کرے، رشوت لے نہ دے، گھر میں صحیح اسلامی پردہ کو نافذ کرے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ اپنے ہی بیگانے بن جائیں گے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا وہ اپنے ہی گھر اور اپنی ہی قریبی سوسائٹی میں نکو بن کر رہ جائے گا۔ اس کا وہ مذاق اڑے گا کہ توبہ ہی بھلی.....

حاصل گفتگو یہ نکلا کہ اگر کسی معاشرہ میں انقلاب محمد علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے لئے مرحلہ وار کام ہو رہا ہے۔ دعوت و تبلیغ کا مرحلہ چل رہا ہے، تنظیم کا مرحلہ چل رہا ہے، تربیت کا مرحلہ چل رہا ہے..... اس سلسلہ میں جن تکالیف و مصائب سے سابقہ پیش آ رہا ہے انہیں جھیلا جا رہا ہے اور آئندہ بھی جھیلنے کا عزم ہے تو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے ایک جماعت بنائی جائے گی (اس جماعت کی حیثیت و تشکیل کی نوعیت کے بارے میں بھی انشاء اللہ مفصل گفتگو ہو گی)..... اب فرض کیجئے کہ یہ جماعت اتنی مضبوط اور موثر ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو اس اقدام اور تصادم کے مراحل کے موقع پر وہ جماعت کیا کرے گی..... ؟ اس کی نوعیت کیا ہو گی ؟ اسی مسئلہ سے بات شروع ہوئی تھی..... تو اب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے ہمیں تمدن کی موجودہ ارتقائی صورت حال نے کچھ متبادل طریقے دیئے ہیں..... وہ کیا ہیں..... ؟ اب اس مسئلہ پر گفتگو شروع ہوتی ہے..... آپ سے پوری توجہ مرتکز کرنے کی درخواست ہے۔ (جاری ہے)

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

اور سب مل کر اللہ کی رسّی مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو

Seiko
BRAKE + CLUTCH LINING

میسی فرگوسن ٹریکٹر کے ہر ماڈل پرزہ جات کے ہول سیل ڈیلر

S SEIKO

سٹاکسٹ: طارق آٹوز ۱۳۔ نظام آٹو مارکیٹ بادامی باغ لاہور۔ فون: ۲۰۰۹۶۰

مسئلہ سندھ کا حل: کیا اور کیسے؟

مسئلہ سندھ کی اہمیت کے پیش نظر اس شمارے میں بھی اس موضوع پر دو اہم مقالات شائع کیے جا رہے ہیں۔ یہ دونوں مقالے اپریل میں منعقد ہونے والے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات میں پیش کیے گئے تھے۔ پہلا مقالہ بزرگ صحافی اور تجزیہ نگار جناب عبدالکریم عابد کے قلم سے ہے۔ انہوں نے حکمرانوں کی تعلیوں اور سیاست دانوں کی خود غرضیوں سے عبارت پاکستانی سیاست کے اندھیروں کی کوکھ سے جنم لینے والے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے اس مسئلے کا حل بھی تجویز کیا ہے۔ دوسرے مقالے میں سندھ کے اُبھرتے ہوئے دانشور صحافی جناب محمد موسیٰ بھٹو نے اہل سندھ کی سیاسی و معاشی محرومیوں اور ان کی بنیاد پر اُٹھنے والی تحریکوں کے حوالے سے فکر انگیز گفتگو کی ہے۔

تاریخ سندھ سے متعلق "میثاق" اپریل ۸۶ء میں شائع شدہ سید غلام مصطفیٰ شاہ کے انگریزی مضمون کے ترجمے کی پہلی قسط، ڈاکٹر عبدالخالق صاحب کا وضاحتی خط اور کراچی سے جناب محمد حنیف سلیمی صاحب کا مراسلہ بھی شاملِ اشاعت ہیں۔
(ادارہ)

پاکستانی سیاست اور مسئلہ سندھ

عبدالکریم عابد

پاکستان کے ہر حکمران نے یہ دعویٰ کیا کہ اُس کے دور میں پاکستان مضبوط اور مستحکم ہو گیا ہے۔ اب پاکستان پر کوئی آنچ نہیں آ سکتی کیونکہ ملکی سالمیت اور استحکام کے کلّے بہت مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں۔ لیکن اس طرح کی ہر یقین دہانی آخر کار غلط ثابت ہوئی اور آج پاکستان اپنی تاریخ کے بدترین عدم استحکام کا شکار ہے۔ اور ہمارا نظریاتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی انتشار اور اضمحلال خطرہ

کی تمام حدوں کو پار کر گیا ہے۔

یہ صورت حال اس بنا پر ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنی ذات کے استحکام کو ملک کا استحکام سمجھا اور اس پر خوش ہوتے رہے کہ ہماری انتظامی مشینری مخالفین کو دبانے کچلنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے لیکن انہوں نے نہیں دیکھا کہ اس طرزِ حکمرانی کے سبب وہ ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں کیونکہ جبر کی حکومت یا تو غلامانہ ذہن کو پروان چڑھاتی ہے یا نفرتوں کی آگ کو جنم دیتی ہے۔ ہمارے عدم استحکام کا بھی اصل سبب یہ ہے کہ وطن عزیز کو یا تو براہ راست مارشل لاء کے ڈنڈے سے چلایا جاتا رہا یا قوم پر ایک جعلی جمہوریت مسلط کر دی گئی آج بھی یہی صورت حال ہے اور ہم ملکی استحکام کی پہلی اینٹ رکھنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ حکمرانوں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان جلد از جلد نئے انتخابات کرانے کے بارے میں سمجھوتہ ہو اور اقتدار اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہو جو معروف اور مسلّمہ جمہوری طریقوں سے منتخب ہو کر آئیں اور عوام کو بھی یقین ہو کہ اصل فیصلہ کُن طاقت بُلٹ نہیں بیلٹ ہے۔

پس ملک کے عدم استحکام کے لئے یقیناً بڑی حد تک حکمران ذمہ دار ہیں لیکن حزب اختلاف کے رہنماؤں کی سیاست میں بھی کچھ قصور اور فتور ضرور ہے اس سیاست کی بنیاد ہمیشہ منافقت اور بے اُصولی پر رہی ہے یہ مسلسل قلابازیاں کھاتی رہتی ہے کبھی جمہوریت کا موقف ہے کبھی جلاؤ گھیراؤ کا، کبھی سوشلزم کا نعرہ بلند ہوتا ہے اور کبھی جاگیرداروں کو سینے سے لگایا جاتا ہے کبھی سیاستدان مل کر نظامِ مصطفےٰ کا سوانگ رچاتے ہیں مگر بھٹو کی پھانسی کے بعد شادیانے بجا کر اپنی راہ ہو لیتے ہیں ایک وقت میں صوبوں پر فوجی کشی کی حمایت ہوتی ہے دوسرے وقت میں یہی لوگ صوبائی خود مختاری کے چیمپئن بن کر ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح امریکی سامراج کی مخالفت کا علم بلند کیا جاتا ہے اور پھر مصلحت دیکھ کر اس علم کو پھینک دیا جاتا ہے کبھی جمہوریت کے شوق میں ایسے دیوانے ہو جاتے ہیں کہ اپنی کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا اور کبھی چُپ چاپ آمریت سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں غرض اس منافقت اور بے اُصولی کی سیاست نے بھی ملک میں سیاسی عدم استحکام کا زہر گھولا ہے

اور اس کی وجہ سے سیاسی جماعتیں فیصلہ کن طاقت حاصل کر سکی ہیں نہ رائے عامہ میں یقین محکم عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی انقلاب انگیز خصوصیات اور کیفیات راسخ ہو سکی ہیں اس لئے ہمارے تمام سیاست پسند عناصر کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ جس طرح فوجی آمریت اور جعلی جمہوریت سیاسی استحکام کے لئے زہر ہے ایسے ہی سیاسی موقع پرستی اور بے اصولاپن بھی سیاست میں استحکام ختم کر کے انتشار بڑھائے چلے جا رہا ہے اس بے اصولی اور موقع پرستی نے ہی مسلم لیگ کا خاتمہ کیا تھا اور یہی وہ دیمک ہے جو ہر سیاسی جماعت میں موجود ہے اور اُسے چاٹ رہی ہے۔

سیاسی استحکام سے ہماری محرومی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران اور ہمارے حزب اختلاف کے سیاستدان دونوں ایک ہمہ وقتی محاذ آرائی میں مصروف رہتے ہیں۔ اس طرح کی محاذ آرائی صرف بیرونی سامراج کی ضرورت پورا کرتی ہے کہ قوم تقسیم رہے اس میں خانہ جنگی کے امکانات موجود ہوں اور حکمرانوں کا اپنے عوام اور سیاسی عناصر سے رشتہ دشمنی اور عداوت کا ہو اس لئے سامراج ان میں سے ہر فریق کو تھپکیاں دیتا ہے کہ وہ عداوت میں گہرے اور پختہ ہوں۔ کبھی بھی سیاسی مفاہمت یا مصالحت کو قبول نہ کریں، اور پھر مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان قرون وسطیٰ کے مذہبی فرقوں کی طرح عداوت دیکھ کر بھی سامراج کو اطمینان رہتا ہے کہ یہ قوم کبھی متحد نہیں ہو سکتی اور اس کے زعماء ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے اس طرح حکمران اور دوسرے سب گروہ سامراج کے کھیل کو ہی آگے بڑھاتے ہیں اور سیاست ایسے تفرقے کو پروان چڑھاتی رہتی ہے کہ حکمرانوں سمیت ہر گروہ بیرونی طاقتوں کی جانب دیکھنے اور ان سے آس لگائے رکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو ایک دوسرے سے مصالحت نہیں کرتے بیرونی آقاؤں یا سامراج کے آگے جھک جانا پسند کر لیتے ہیں۔

پاکستان کے سیاسی عدم استحکام کی تاریخ بہت پرانی ہے اور اس المناک تاریخ کے ہر صفحہ پر مرکز اور صوبوں کی کشمکش جلی حرفوں میں نظر آتی ہے اس کشمکش کی وجہ سے ہی پہلے تو دستور نہیں بن سکا اور جب بنا تو مارشل لاء کی

نظر ہو گیا یہ غیر جمہوری اور آمرانہ مرکز ہی تھا جس نے ایک طرف مشرقی پاکستان کے بڑے صوبے اور دوسری طرف مغربی پاکستان کے چھوٹے صوبوں کی نفسیات کو غلط کیا اور انہیں سیاسی طور پر بدراہ بنایا اس لحاظ سے آج سندھ ایک خطرناک نقطہ پر پہنچ گیا ہے اور ڈاکٹر اسرار احمد نے صحیح فرمایا ہے کہ پاکستان کی قسمت کا فیصلہ سندھ کے ریگ زاروں میں ہوگا۔

سندھ کے بارے میں حکمران حلقوں کی سوچ یہ نظر آتی ہے کہ وہ سندھ پر ایک زبردست مار دھاڑ مسلط کر کے حالات کو ٹھیک کر لیں گے اُن کا خیال ہے کہ جو تجربہ مشرقی پاکستان میں ناکام رہا وہ سندھ میں کامیاب ہو سکتا ہے اس مقصد کے لئے سندھ کی تحریک اور شخصیات کو ابھارا بھی جا رہا ہے تاکہ بعد ازاں مار دھاڑ کی کارروائیوں کے لئے جواز اور حالات پیدا ہو سکیں حکمران گروہ میں ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ اگر ہم سندھ کی غیر سندھی آبادی کو رشوت اور تقسیم تر کے طور پر سندھیوں کے حوالے کر دیں تو سندھ پنجاب کی مفاہمت قائم ہو جائیگی کچھ لوگ اس کے برعکس سوچنے والے بھی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تقسیم اور ٹکراؤ کو بڑھا کر اور پھیلا کر حکومت کی جا سکتی ہے لیکن چالاکیوں عیاریوں سے اور تشدد یا فوجی کارروائیوں کے ذریعہ مسئلہ سندھ سلجھنے کی بجائے مزید الجھ جائیگا۔

سندھ کے مسئلہ کا حل صرف جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات ہیں۔ اگر سارے پاکستان میں نہیں تو کم از کم سندھ میں موجودہ اسمبلی کو توڑ کر فوراً جماعتی بنیادوں پر نئے انتخابات کرا دیئے جائیں اس سے سندھ کا مسئلہ صحت مند انہ طریقے سے طے کرنے کی طرف پیش رفت ہو سکے گی ورنہ سندھ جو نظریاتی طور پر ہاتھ سے نکل چکا ہے عملی طور پر بھی موقع ملتے ہی باغی ہو جائے گا اور آپ نے سامراج بن کر اس علاقے کو اپنی گرفت میں رکھنے کی کوشش کی تو یہ کوشش زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں رہ سکے گی۔

سندھ کا مسئلہ آج پیدا نہیں ہوا یہ پاکستان کی پیدائش کے ساتھ ہی پیدا ہوا تھا لیکن ہم نے اس سے آنکھیں چار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی آج سے اٹھارہ سال پہلے ۱۹۶۸ء میں جئے سندھ تحریک پر میرے مضامین ایک سال تک روزنامہ حریت میں قسط وار شائع ہوتے رہے اور ان مضامین میں جئے سندھ تحریک کی

صورت حال اُس کے سیاسی معاشی ثقافتی نفسیاتی اسباب و علل اس کی ہمارے مستقبل اثر اندازی کے امکانات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا اس کے ساتھ ہی میں نے سال بھر تک سندھی بھائیوں کے وہ سینکڑوں خطوط حُریت میں شائع کئے جن میں اپنی محرومیوں کا گلہ تھا اور سندھ کی ہر شکایت اور ہر احساس کو بیان کیا گیا تھا لیکن افسوس کہ ہمارے حکمران پالیسی ساز ادارے اپنی الگ دنیا میں رہتے ہیں - اور اس دنیا سے باہر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور آنکھ بند کر کے اپنی ڈگر پہ چلتے رہتے ہیں اگر اٹھارہ سال پہلے ان مضامین اور خطوط کا نوٹس لیا جاتا اور مثبت کارروائیاں کی جاتیں تو اس کے اچھے ثمرات آج دیکھے جا سکتے تھے -

سندھ کے ساتھ عجیب حادثے پیش آئے پہلا ظلم یہ تھا کہ ہماری سول اور فوجی بیوروکریسی نے آمریت کا اقتدار قائم کیا اور اس میں سندھ کسی اعتبار سے بھی شریک نہیں تھا اس کی حیثیت ایک مغلوب اور محکوم کی تھی پھر اچانک یہ ہوا کہ بھٹو صاحب کی وجہ سے سندھ کے لوگوں کے ہاتھوں میں غیر فطری انداز سے اقتدار آگیا اور دیہاتوں کے وڈیرے اپنا لاؤ لشکر لے کر نہ صرف سندھ کے شہروں بلکہ پاکستان کے مرکز اسلام آباد میں بھی داد عیش دیتے نظر آنے لگے اس زمانے میں سندھ کی قدیم محروم آبادی کے متوسط اور غریب طبقہ نے بھی بھٹو اقتدار کے بہتے ہوئے دریا سے اپنی پیاس بجھائی مگر چند جام پی کر بہک گئے اور یہ خیال نہیں کیا کہ بساط الٹ بھی سکتی ہے اس لئے وہ جمہوریت، صوبائی خود مختاری شہری حقوق اسلام ہر تحریک سے الگ تھلگ جئے بھٹو کے نعرے لگاتے مست پڑے رہے لیکن جب بساط اُلٹ گئی تو بھٹو پھانسی کے تختے پر پہنچ گئے اور ان کی یہ موت ہر سندھی کے دل کا زخم بن گئی اس زخم کے لئے مرہم کا انتظام بھی کوئی نہیں تھا صرف مارشل لاء کے کوڑے فضا میں لہراتے رہے یا حکومت نے بھٹو پرستی کو دُور کرنے کے لئے سندھ میں دوسری طاقتوں کو اُبھارا جس میں پیر پگارا گروپ کے علاوہ جئے سندھ تحریک اور کنفیڈریشن والے شامل ہیں، اس تدبیر نے ممکن ہے سندھ میں پیپلز پارٹی کا اثر کم کیا ہو لیکن قومی نقطۂ نظر سے اس نے ملکی استحکام کو مزید نقصان پہنچایا اور آج سندھ کی سیاست نہ صرف دیہی علاقوں بلکہ شہروں علاقوں میں بھی پاکستان کے

نظریاتی اور ریاستی استحکام کو غارت کر رہی ہے اور فوری انتخابات کے بغیر اس سیاست کے پٹڑی پر آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

سندھ کے مسئلہ پر تو تفصیلاً کل کے اجلاس میں بحث ہو گی لیکن آج میں اپنے سندھی دوستوں کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اہل سندھ پر یہ واضح کریں کہ اگر انہیں جمہوری اساس پر ایک نیا سندھ مطلوب ہے تو اس کے لئے انہیں ایک نئی سیاسی قیادت بھی پیدا کرنی ہو گی قدیم طرز کی وڈیرہ شاہی کی قیادت میں سندھ کا بھلا نہیں ہو سکتا اور نظریاتی انتشار میں مبتلا عقیدہ، ایمان، اخلاق، کردار سے محروم متوسط طبقہ بھی سندھ کو کسی منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس لئے استحکام پاکستان کے نقطۂ نظر سے سندھ کے حقوق کی پوری پوری حمایت کے ساتھ میں اہل سندھ کو ان کی ذمہ داریاں بھی یاد دلانا چاہتا ہوں اُن ذمہ داریوں کے شعور کے بغیر سندھ ہمیشہ ایک خطرناک عدم استحکام کا شکار رہے گا جو عدم استحکام غیر جمہوری اور آمرانہ مرکز نے پیدا کیا ہے۔ اُس کا علاج یہ نہیں ہے کہ علاقائی عصبیتوں کی بنیاد پر سیاسی افراتفری اور اخلاقی بے راہ روی پھیلائی جائے اس سے پاکستان ممکن ہے ختم ہو جائے لیکن سندھ بھی بچ نہیں سکے گا اور اس کے پرخچے اڑ جائینگے اس لئے سندھ کا اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم کسی ملّی اور قومی سوچ اور کسی روحانی اور اخلاقی فلسفہ کو اپنائے رکھیں اور کوشش یہ کریں کہ جلد از جلد نئے انتخابات کے ذریعہ ایک نئی مثبت اور صحت مند سیاست اس علاقے میں شروع ہو۔

ملکی استحکام کے لئے سب سے بڑی ذمہ داری اہل پنجاب پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ آبادی اور وسائل ہر اعتبار سے غالب حیثیت رکھتے ہیں اُن کے لئے نہ تو یہ صحیح ہے کہ وہ چھوٹے صوبوں کے محسوسات کی طرف سے اپنی آنکھیں کان بند رکھیں اور نہ یہ صحیح ہو گا کہ وہ علاقائی نیشنلزم کے آگے ہتھیار ڈال دیں کیونکہ اصل ضرورت لسانی قومیتوں کے طرز فکر سے سمجھوتے کی نہیں ہے صرف جمہوریت کو عملاً جاری و ساری کرنے اور نافذ کرنے کی ہے اگر جمہوریت ہو گی تو قومیتوں کے فلسفے خود بخود بے جان ہو جائینگے ورنہ ان کے خلاف کا غذی جہاد

کوئی فائدہ نہیں دیں گے اور نہ ان کے ساتھ مداہنت کا طرزِ عمل ملک کو استحکام عطا کر سکے گا استحکام دینے والی چیز صرف جمہوریت اور عوام کے حقیقی نمائندوں کو اقتدار کی منتقلی ہے اگر یہ ہوگا تو پاکستان کے مستقبل کو خطرہ نہیں آپ کے سارے کِلے ایک ایک کر کے ٹوٹتے جائیں گے اور آپ کی داستان تاریخ میں ایک عبرت یا مضحکہ کے طور پر رہ جائیگی۔

(۲)

مسئلہ سندھ — ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد موسیٰ بھٹو

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب "استحکام پاکستان بسلسلہ سندھ" ایک ایسی کتاب ہے جو سندھ کے موجودہ رجحانات، مسائل اور مزاج کو سمجھنے، سندھ کے مسئلہ کو پیچیدہ بنانے میں حکومت، پنجاب اور سندھی و مہاجر لسانی اکائیوں کے کردار اور سندھ کے حوالہ سے پاکستان کو درپیش خطرات کی روک تھام اور اس کے لئے تجاویز پر ایک مؤثر، فکر انگیز اور بھرپور کتاب ہے۔ دینی طبقہ میں ڈاکٹر صاحب پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے روایتی مذہبی دائرے اور خول سے باہر نکل کر علاقائی مسائل کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ اس سلسلے میں ہمارے بیشتر مذہبی حلقے اب تک جمود کا شکار ہیں۔ وہ مسلم قومیت اور اسلامی قومیت کے مثالی نصب العین سے ہٹ کر حقائق کا سامنا کرنے اور حالات کے معروضی تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں۔ ظاہر ہے حالات و مسائل کے صحیح تجزیہ کے بغیر اسلام اور پاکستان کو درپیش چیلنج کا مقابلہ تو کیا اسے سمجھا بھی نہیں جا سکتا

کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے لسانی اکائیوں بالخصوص سندھ کے مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں عادلانہ معاشی نظام اور جمہوریت کے فروغ پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ نقطۂ نگاہ قابلِ تعریف ہے کہ چونکہ ملک میں اقامتِ دین کی تحریک کمزور ہے اس کے توانا ہونے تک قومیتوں کے جھگڑوں اور فوجی حکمرانوں کے پیدا کردہ مسائل سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا، اس

لئے آزادانہ انتخابات اور صحیح جمہوریت کی بحالی ہی وہ عمل ہے جس سے ہم سندھ میں قومیت کی تحریک کو ناقابل تلافی واپسی پر جانے سے روک سکتے ہیں۔ سالمیت پاکستان کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے پیپلز پارٹی اور مس بے نظیر بھٹو کے کردار پر بھی بات کی ہے اور قومی سیاست سے بے نظیر کی مایوسی کو ملکی سالمیت کے لئے سخت نقصان دہ اور سندھو دیش تحریک کے لئے تقویت کا باعث قرار دیا ہے۔ یہ بات بہت سارے لوگوں کے لئے اچنبھے کی بات ہوگی کہ ڈاکٹر اسرار احمد جیسا بالغ نظر عالم دین ایک ایسی جماعت کی افادیت و اہمیت ثابت کر رہا ہے جو سیاست میں سیکولرازم کی علمبردار ہے لیکن سندھ میں پاکستان کے حوالے سے سوچ جس طرح انتہا پسندانہ ہوگئی ہے اور منفی طاقتوں کا عمل دخل اور دباؤ جس تیزی سے بڑھا ہے اس میں اب تنہا پیپلز پارٹی ہی رہ گئی ہے جو اس دباؤ کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور عام لوگوں کی اکثریت مس بے نظیر بھٹو سے جذباتی وابستگی رکھتی ہے اس لئے اگر بے نظیر بھٹو بھی قومی دھارے سے کٹ کر علاقائیت اور سندھی نیشنلزم کی علمبردار بن گئی تو یہ ملک کے لئے انتہائی خطرناک بات ہوگی۔ جی ایم سید، ممتاز بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ وغیرہ کی کوشش یہی ہے کہ ایسا ہو۔ یہ ایک تشویشناک اور المناک بات ہے کہ حکومت ایک عرصہ سے پیپلز پارٹی کی قوت توڑنے کیلئے علاقہ پرست تحریکوں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کر رہی ہے۔ اس سلسلہ میں فوری نوعیت کا صحیح حل وہی ہے جو ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے۔

میں مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کی کتاب "استحکام پاکستان بسلسلہ سندھ" کو اسلام اور پاکستان کی خدمت اور علاقائی رجحانات کی تفہیم کے حوالے سے ایک کامیاب اور مستحسن کوشش تصور کرتا ہوں۔ کتاب کے بارے میں ان تاثرات کے بعد اب میں سندھ میں اسلام و پاکستان کی سالمیت کے حوالہ سے گفتگو کروں گا۔

سندھ جو برصغیر ہند میں باب الاسلام کی حیثیت رکھتا ہے اور سندھی عوام جو مزاجاً اسلامی قناعت، مہمان نوازی، سادگی اور توکل جیسی صفات کے حامل رہے ہیں اور اب بھی ایک حد تک یہ صفات ان کے اندر موجود ہیں، بدقسمتی سے تاریخ میں پہلی بار ایسے موڑ پر کھڑے ہوگئے ہیں، جہاں یہ نظر آتا ہے کہ مزاج میں جھنجھلاہٹ، غصہ، نفرت، تعصب، سیاسی اور اغراضی اسلام سے بیزاری نظر آرہی ہے اور پنجاب اور اہل پنجاب سے اسلامی حوالہ سے رشتہ و تعلق میں تیزی سے کمزوری آرہی ہے۔ اور نفرت و کدورت کی صورتحال پیدا ہو رہی ہے۔ پڑھی لکھی سندھی آبادی

وہ چاہے شہروں میں رہتی ہو یا دیہات میں، اس معاملہ میں اس کے جذبات و احساسات کافی آگے جا چکے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کا ایک قابلِ ذکر طبقہ جو ہزاروں سے متجاوز ہے ایسا بھی پیدا ہو چکا ہے جس کا علمی، شعوری اور ذہنی طور پر اسلام پر اعتماد بری طرح متزلزل ہو چکا ہے۔ وہ جدلیاتی تاریخی مادیت، لادینیت اور سیکولرازم کا قائل ہو چکا ہے اور اسلام کو وہ جدید دور میں رہنمائی کے لئے ناقابلِ عمل سمجھتا ہے۔ سندھی نیشنلزم کی بات تو عام ہے۔ عام طور پر ہر سندھی زیناً یا تو نیشنلسٹ بن چکا ہے یا وہ نیشنلسٹ تحریکوں اور حالات کے شدید دباؤ سے متاثر ہو کر نیشنلزم کی بات کرتا ہے۔ بڑے سے بڑا سمجھدار مذہبی فرد بھی پنجاب، پنجابی افسر شاہی کے تسلط اور زیادتیوں کا رونا روئے بغیر آپ کو نہیں ملے گا۔

کمیونسٹ اور نیشنلسٹ تنظیموں کی طرف سے چھوٹے بڑے اسٹڈی سرکل، ہفتہ وار اور ماہانہ نشستوں، کانفرنسوں اور نشستوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری ہے جس میں نظریاتی مباحث، عوام میں نفوذ، آزادی اور انقلاب کے لئے حکمت عملیاں اور انقلاب و آزادی کی تحریکوں پر لیکچر دیئے جاتے ہیں اور مقالے پڑھے جاتے ہیں۔ علمی اور عملی طور پر شاید ہی کوئی شعبہ ہو، جس میں کام شروع نہ ہو چکا ہو۔ پاکستان میں اسلام سے عملی طور پر دوری، مادیت اور دنیا سے محبت کی برائیاں تو ہر صوبہ میں بڑے پیمانے پر پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن سندھ میں اسلام کے بنیادی عقائد و ایمانیات سے انحراف و ارتداد کی جو لہر شروع ہوئی ہے وہ بے حد تشویشناک ہے اور وہ کسی دوسرے صوبہ میں اس انداز سے موجود نہیں ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو سندھ میں پیدا ہو چکی ہے لیکن انتہائی کرب اور اذیت کی بات ہے کہ پنجاب (جو ہر اعتبار سے بڑے بھائی کی حیثیت رکھتا ہے) میں اب تک سندھ کے حالات کی اس سنگینی کو سمجھنے اور اس کے تدارک کے انتظامات کرنے اور روٹھے ہوئے بھائی کو پرچانے کی فکر اور تشویش پیدا نہیں ہوئی۔ ہماری نوکر شاہی اور سیاسی مذہبی جماعتوں پر یا تو بے حسی طاری ہے یا وہ "سب ٹھیک ہے" کی عینک لگائے ہوئے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کا وقت آنے پر طاقت سے کچل دینے کا نقطۂ نگاہ ہے۔ لیکن ملکوں، قوموں اور لسانی اکائیوں کے علاقوں کو ساتھ لے کر چلنے اور چلانے کے یہ آداب ہرگز نہیں ہوتے۔ اس کے لئے بڑی چوکسی، بیداری، دور بینی اور بردباری کی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ پنجاب عددی

اعتبار سے بڑا صوبہ ہونے کے ساتھ ساتھ طاقت کے مرکز کا صوبہ بھی ہے اس لئے اس سلسلہ میں پنجاب پر زیادہ اور بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر سمجھے سمجھانے اور اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کے سلسلہ میں بڑے صوبہ کی حالت یہ ہو جائے تو پھر حالات کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

آئیے اب مختصر طور پر یہ دیکھیں کہ آخر یہ صورتحال کیونکر پیدا ہوئی اور اس کے محرکات کیا ہیں: میرے نزدیک اس کے بنیادی اسباب درج ذیل ہیں :-

(۱) اسلامی نظام تعلیم سے انحراف: نظریاتی قومیں نظام تعلیم کے ذریعے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی قوم اپنے نظام تعلیم میں ریاستی نظریئے کو بنیاد بنائے بغیر فکری اور عملی خلفشار سے بچ سکے، یہ ممکن ہی نہیں۔ نظام تعلیم میں اتنی بڑی بنیادی تبدیلی کہ اسے اسلام کے ہم آہنگ بنایا جاتا، اس کے لئے پاکستان میں مضبوط اور طاقتور اسلامی نظریاتی قوت کا ہونا ضروری تھا۔ طاقت ور نظریاتی جماعت کے بغیر محض خارجی دباؤ سے اس طرح کے فیصلہ کن اقدامات نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے پاکستان کو طاقتور نظریاتی اسلامی قوت نہ پہلے میسر تھی اور نہ اب ہے۔

علاقوں اور صوبوں کو ساتھ لے کر چلنے کی دوسری صورت یہ تھی کہ ملک میں جمہوریت کو فروغ دیا جاتا اور صوبوں کو اندرونی معاملات میں خود مختاری دی جاتی۔ جدید دور میں بڑے بڑے ترقی یافتہ مغربی ممالک بھی جمہوریت کے بغیر اپنی سلامتی اور یک جہتی کو خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ روس جہاں کلیت پسندانہ نظام ہے اس نے بھی کنٹرولڈ نظام کی خرابیاں محسوس کر کے فرد کی آزادی اور جمہوریت کی طرف سفر کی آغاز کر دیا ہے ورنہ روس جیسے طاقتور ملک کا زیادہ عرصہ تک اپنی پوزیشنوں کو قائم رکھنا دشوار ہوگا۔ جمہوریت کی خرابیاں اپنی جگہ (اگرچہ اس میں مسلسل ارتقاء کا عمل جاری ہے) لیکن آمرانہ طرز حکومت میں عام لوگوں بالخصوص مختلف لسانی اکائیوں کے اندر مایوسی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو روکنا دشوار ہے۔

سندھ میں پنجاب کی عددی اکثریت کے غلبہ کا خوف قیام پاکستان سے پہلے سے سیاسی لیڈروں اور صحافیوں کے ذہنوں میں موجود تھا۔ پیر علی محمد راشدی نے اس سلسلہ میں ۱۹۴۶ء میں آخر میں " فریاد سندھ " کے نام سے سو سے زائد صفحات پر مشتمل پوری کتاب لکھی تھی۔ جس میں ثابت کیا گیا تھا کہ پاکستان میں شمولیت کے بعد سندھ تجارتی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے پنجاب کی کالونی بن جائے گا۔ لیکن پیر علی محمد راشدی صاحب کی سیاسی وابستگیاں بدلتی رہتی

تھیں ۔ اس لئے ان کی بات کو اس پس منظر میں دیکھ کر مسترد کیا جاسکتا ہے ۔ لیکن اس مسئلہ پر مولانا خیر محمد نظامانی، مولوی عبدالغفور سیتائی اور سید سردار علی شاہ جیسے لوگ جن کی زندگیاں اسلام کے فروغ اور باطل قوتوں سے مقابلہ میں گزری ہیں اور جن کا صحافتی میدان میں اسلام کے لئے کام تاریخ کا حصہ بن چکا ہے ۔ پنجاب سے اپنے حقوق کے تحفظ میں اور صوبائی خود مختاری کے سلسلے میں ان کے خیالات اور رجحانات بھی وہی رہے ہیں جو عام طور پر اس وقت سندھ میں موجود ہیں ۔

میں آپ کی معلومات کے لئے مذکورہ بالا اسلام دوست صحافیوں کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں ۔ مولانا خیر محمد نظامانی روزنامہ باب الاسلام کے ۷ جون ۱۹۴۷ء کے شمارے میں لکھتے ہیں ۔

" ہندوستان سے علیحدہ ہو کر پاکستان کو جو ملٹری ملے گی وہ تقریباً پنجاب کی ہوگی ۔ ان حالات میں پنجاب کے دیگر کمزور صوبوں پر غالب ہونے کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ۔ ان حالات میں اہل سندھ کو چاہیئے کہ وہ قبل از وقت بیدار ہوں اور پاکستان فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے یہ شرط لگائیں کہ پاکستان میں صوبوں کو یکساں نمائندگی حاصل ہوگی اور فوج میں بھی سندھ کو کافی نمائندگی ملنی چاہیئے ۔ پاکستان کو ایک صوبہ کی ملٹری کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہیئے اور دریائے سندھ کے پانی کے بارے میں بھی اس وقت ایسی ہی شرائط عائد کرنی چاہیئے نیز جو شعبے صوبے آسانی سے چلا سکتے ہیں ان میں مرکز کی عدم مداخلت کی بات بھی طے ہونی چاہئیں ۔ اگر سندھ کے لوگ بیدار نہ ہوئے تو پھر وہ پنجاب کے تسلط سے بچ نہیں سکیں گے ۔"

یاد رہے کہ یہ تحریر قیام پاکستان سے پہلے کی ہے

مولانا عبدالغفور سیتائی لکھتے ہیں : " پاکستان کی نئی دستور ساز اسمبلی کے لئے خاکہ تیار کر لیا گیا ہے جس میں ملک صوبوں کا فیڈریشن ہوگا اور ملک کے لئے ایک وفاقی اسمبلی ہوگی جس کے دو ایوان ہوں گے ۔ ان دونوں ایوانوں میں ملک کے مغربی حصہ کو یکساں نمائندگی دی گئی اور یہ نمائندگی صوبوں کی آدم شماری کی بنیاد پر دی گئی ہے ۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں نے پاکستان کا مطالبہ اس مقصد کے لئے کیا تھا ۔ تاکہ وہ ہندو اکثریت کی غلامی سے نجات حاصل کر سکیں اور ہندو اکثریت مسلمان اقلیت پر ووٹ کی برتری کے باعث ان پر حکمران بن کر من مانی نہ کرے لیکن بنیادی اصولوں پر مبنی کمیٹی نے پاکستان کے لئے جو دستور بنایا ہے اس میں اکثریت کا اقلیت پر وہی حکمرانی کرنے کا اصول تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ متحدہ

ہندوستان کی صورت میں ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر حکمرانی کرتی ہے۔ اس طرح وہاں بڑے صوبے چھوٹے صوبوں پر حکمرانی کرتے۔ یہاں بھی بعینہٖ اقلیت پر اکثریت کے راج کو مستحکم کرنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ ہم نے جس مصیبت سے بچنے کے لئے پاکستان کے علیحدہ وطن کے قیام کا مطالبہ کیا تھا وہی مسائل اب ہمارے لئے پاکستان میں پیدا کئے جا رہے ہیں۔"

(روزنامہ نوائے سندھ ۲۴ دسمبر ۱۹۵۲ء)

مولانا خیر محمد نظامانی، مولانا عبدالغفور سیتائی اور سید سردار علی شاہ کے اس طرح کے سینکڑوں ادارتی نوٹ ہیں جو قیام پاکستان سے کچھ پہلے اور بعد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ سندھ میں پنجاب کی بالادستی اور صوبائی خود مختاری کے متعلق جو رجحانات پروان چڑھے ہیں وہ جی ایم سید اور ملک دشمنوں کے ہی پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اس معاملہ میں مذہبی دانشوروں اور صحافیوں کے خیالات بھی یکساں ہیں۔ بدقسمتی سے قومی سطح پر سندھ کے ان تیز احساسات کو گہرائیوں میں اتر سمجھنے کی بجائے اسے ملک دشمنی سے موسوم کیا گیا۔ دوسری طرف عملاً جو صورتحال رہی وہ بھی فوجی آمریت اور مارشل لاء کا تسلط تھا

(۳) سندھ میں پاکستان اور اسلام کے لئے حالات سازگار بنانے میں ایک بڑی رکاوٹ سندھی نوجوانوں کی بڑی پیمانے پر بے روزگاری بھی ہے۔ سندھی بے روزگار ایسوسی ایٹس کے اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں اس وقت سندھی زبان بولنے والے بے روزگار گریجوایٹ افراد کی تعداد ستر ہزار سے زائد ہے۔ جن میں چھ سات ہزار ڈاکٹر ہیں تو سات آٹھ ہزار انجینئر ہیں۔ میٹرک اور انٹر پاس بے روزگار نوجوانوں کی تعداد اس سے زائد ہے۔ جو دیہاتی زندگی کے لئے ایک سنگین معاشرتی اور سماجی مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس لئے کہ یہ لوگ کاشت کاری کرنے سے تو قاصر ہیں۔ زراعت میں ویسے بھی اب گنجائش کم ہے۔ ٹیکنیکل اور فنی علم ان کو نہیں آتا۔ اندرون سندھ صنعتی ادارے تو موجود ہی نہیں۔ شہروں میں پہلے سے مقابلہ سخت ہے۔ معاشی اعتبار سے تاریک مستقبل کی وجہ سے یہ نوجوان نہ صرف فکری انتشار کا شکار ہیں بلکہ عملی طور پر مختلف تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

سندھ میں گذشتہ ۳۰ سال کا عرصہ ایسا رہا ہے جس میں سندھ کا چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری آئی جی اور دوسرے اہم کلیدی عہدے زیادہ تر پنجاب سے وابستہ افراد کے سپرد رہے ہیں۔ اس طرح مرکزی شعبے، واپڈا، ریلوے، انکم ٹیکس، پی آئی اے، کسٹم، کراچی پورٹ ٹرسٹ وغیرہ

ان محکموں میں اب بھی کنٹرول پنجاب سے وابستہ لوگوں کا ہے۔ ان محکموں میں سندھی آبادی کا تناسب اب بھی دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ بالخصوص اہم عہدے تو اب بھی ۸۰ فیصد اہل پنجاب کے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ صورت حال ایسی ہے جسے بے روزگار سندھی نوجوان انتہائی تشویش کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اعداد و شمار پر مبنی مضامین اور کتابیں سندھی زبان میں اکثر شائع ہوتی رہتی ہیں

لادینیت اور نیشنلزم کے علمبرداروں کی بنیاد بھی یہی مسائل ہیں۔ اس لئے عام سندھی نوجوان ان کو اپنے حقوق کا چیمپئن تصور کرنے لگتا ہے۔ اور وہ اخلاص کے ساتھ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان کے روزگار اور ان کے جملہ مسائل کا حل ان تحریکوں کی کامیابی سے ہی وابستہ ہے۔ یقیناً اس صورتِ حال میں عام پنجابی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ یہ مرکزی حکومت پر مسلط نوکر شاہی کی اپنے عزیز و اقارب کو نوازنے کی پالیسی کا حصّہ ہے لیکن بہرحال اس کا نتیجہ ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ سندھ میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ بھی سنجیدہ اور غیر متعصبانہ فضا قائم کرنے اور اسلام کے لئے سمجھنے سمجھانے کا ماحول برقرار رکھنے کے راستے میں حائل ہے۔ پنجاب اور سرحد سے کراچی میں آباد ہونے والوں کا سالانہ شرح تین لاکھ ہے۔ اس کی وجہ سے جہاں سندھی آبادی میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں اقلیت ہوتے جا رہے ہیں وہاں کراچی میں مہاجروں میں بھی یہ احساس شدّت اختیار کر رہا ہے کہ کراچی میں وہ مجموعی طور پر اقلیت ہوتے جا رہے ہیں اور جمہوریت کے اصولوں کے تحت کل سیاست، معیشت اور دوسرے شعبوں میں ان سے اقلیت والا سلوک کیا جائے گا۔ اس احساس کی وجہ سے مہاجر نیشنلزم کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ تاہم مہاجر نیشنلزم سندھی نیشنلزم کی طرح مذہب سے کلّی ارتداد کی صورت اختیار نہ کرے گی۔ اس لئے کہ اس کی فکری بنیاد زیادہ گہری اور مضبوط نہیں۔

(۴) بحیثیت مجموعی ہماری ایک بنیادی کمزوری یہ ہے کہ ہم امنگوں کے اعتبار سے مثالیت پسند ( ) واقع ہوئے ہیں اور اپنے ہی بھائیوں کے مادی مسائل اور حقائق کو سمجھنے کے لئے ذہن اور حس سے کام لینے کے روادار کم ہی ہیں۔ مثلاً سندھ میں زرعی زمینوں کے کلیموں کے مسئلے کو لیجئے۔ سندھ کی دیہاتی آبادی ایک عرصہ تک مضطرب رہی کہ کلیموں کے سلسلہ میں اس کے نقطۂ نگاہ کو سمجھا جائے۔ لیکن اتنا اہم مسئلہ جس سے ہزاروں سندھی خاندانوں کے روزگار وابستہ تھے

اس کی اہمیت کو نہ سمجھا جاسکا۔ اگرچہ اس وقت یہ مسئلہ نہیں ہے تاہم چونکہ یہ ایک بنیادی مسئلہ تھا اور علاقائی قوم پرستی کی تحریک کو اس سے کافی تقویت حاصل ہوئی۔ اس لئے مثال کے طور پر اس واقعہ کی تفصیلات بیان کر رہا ہوں۔

سندھ میں انگریز کے قبضہ (۱۸۴۳ء) کے وقت اس علاقہ کی ساری زمین مسلمانوں کی ملکیت تھی۔ ہندوؤں کے پاس زرعی زمین ایک ایکڑ بھی نہیں تھی۔ ان پر زمین خریدنے کی قانوناً پابندی عائد تھی۔ انگریز نے انتقال اراضی کے قانون میں تبدیلی کردی۔ تاہم انگریز کے دور حکومت میں زراعت میں بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے تو اپنی زمین خود کاشت کرنے والے چھوٹے چھوٹے آبادکار بھی۔ انگریز حکومت کی اپنی رپورٹ کے مطابق ۱۹۲۵ء میں سندھ میں ایک لاکھ ستائیس ہزار چھتیس چھوٹے زمیندار تھے۔ جن کے پاس ایک ایکڑ سے پچیس ایکڑ تک زمین تھی لیکن ۱۹۴۶ء تک آتے آتے یہ صورتحال ہوگئی کہ اس طبقہ کی ۹۰ فی صد سے بھی زائد زمین ہندوؤں بنیا، قرض، سود درسود اور غلط حسابوں کے چکر میں اپنے کھاتے میں تبدیل کرچکا تھا۔

سندھ میں مسلمانوں کی ہندوؤں کی طرف جو زمین ناجائز طور پر منتقل ہوچکی تھی اضلاع کے حساب سے اس کے اعداد و شمار کا گوشوارہ درج ذیل ہے:

ضلع	اراضی ایکڑوں میں
ٹھٹھہ	۲۰۹۴۰
حیدرآباد	۳۷۳۴۲
نواب شاہ	۸۱۸۲۰
تھرپارکر	۱۵۰۰۰۰
دادو	۳۶۳۶۱
لاڑکانہ	۱۱۱۷۱
سکھر	۹۰۹۰
جیکب آباد	۵۱۵۸۲

(مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو روزنامہ توحید کراچی ۳ رجون ۱۹۵۲ء)

مسلمانوں کے واحد روزنامے الوحید کی دوسری اطلاع کے مطابق ہندوؤں کی

کل متروکہ زمین ۱۶ لاکھ ایکڑ تھی جس میں ۶ لاکھ ایکڑ مہاجروں کو اور پانچ لاکھ ایکڑ زمین باریوں کو ملی۔ باقی پانچ لاکھ ایکڑ یا تو آبادی کے لائق نہیں تھی یا اس سے پیداوار حاصل کرنے کے لئے کافی رقم کی ضرورت تھی۔ (روزنامہ الوحید ۱۶ مئی ۱۹۵۲ء)

مارچ ۱۹۴۷ء میں سندھ اسمبلی نے انتقال اراضی کا قانون منظور کیا جس کے تحت مسلمانوں کی ہتھیالی گئی ساری زمین انہیں بلا معاوضہ واپس ہونی تھی لیکن اس بل پر گورنر جنرل کو دستخط کرنا تھے۔ اس عرصہ میں پاکستان بن گیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد گورنر جنرل نے پاکستان کے مفاد اور مہاجروں کی آبادی کی وجہ سے اس بل پر دستخط کرنا مناسب نہ سمجھے۔ بہرحال اس طرح دیہاتی سندھی مسلمان جس کا ذریعہ ہی زراعت تھی وہ انگریز اور ہندوؤں کی سازش سے معاشی طور پر پس کر رہ گیا۔ اور قیام پاکستان کے بعد انہیں اپنی زرعی اراضی کی واپسی کی جو امید تھی وہ ایک حد تک ہی پوری ہوئی۔

اسی طرح سندھی زبان اور بیراج کی زرعی زمینوں کے مسائل ہیں۔ ان جائز مسائل کو سمجھنے سمجھانے اور اٹھانے کے لئے قومی سطح پر پلیٹ فارم ہونا چاہیئے۔

چونکہ سندھ کے مسئلہ کو پیچیدہ بنانے میں غلط سیاسی اور معاشی پالیسیوں کو بھی عمل دخل حاصل ہے اس لئے صورت حال کی بہتری کے لئے ہمیں سیاسی اور معاشی میدان میں بھرپور اقدامات کرنے ہوں گے۔ سندھ کی صورت حال کے گہرے تجزیے کے بعد میری یہ دیانت دارانہ رائے ہے کہ سیاسی طور پر ہمیں دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔ تیسری کوئی راہ نہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وفاقی گریز طاقتیں یعنی ممتاز بھٹو کی کنفیڈریشن پارٹی اور جی ایم سندھ طاقتور ہو جائے۔ دوم یہ کہ ہم پیپلز پارٹی کو قبول کریں اور اس سے دشمنی اور محاذ آرائی کر کے اسے کمزور اور ناکام بنانے کی پالیسی ترک کر دیں۔ پیپلز پارٹی کے بعد سندھ میں کوئی ایسی پارٹی نہیں ہے جو عوام میں پاکستان اور وفاق کی بات کر سکے۔ جونیجو صاحب غوث علی شاہ پیر صاحب پگاڑو اور دوسرے وڈیرے سندھ کے نئے خوفناک رجحانات میں بالکل غیر مؤثر ہیں اور وہ زیادہ عرصہ تک صورتحال کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ بلا تاخیر ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت انتخابات کرا کر ملک نئی منتخب حکومت کے حوالے کیا جائے۔ اگر انتخابات کے عمل میں تاخیر کی گئی تو سندھ میں حالات مکمل طور پر کنٹرول سے باہر ہو جائیں گے۔ پیپلز پارٹی جو سندھ میں وفاق پاکستان کی

علامت ہے۔ اس وقت اس کی بھی صورتحال یہ ہے کہ پڑھی لکھی سندھی آبادی اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہے۔ ذوالفقار بھٹو کے نام کی وجہ سے عوام میں اب تک مس بے نظیر کے ساتھ جذباتی وابستگی موجود ہے۔ لیکن وقت کے ضیاع کے ساتھ اس مقبولیت میں تیزی سے کمی آنے کا امکان ہے۔ اس کے بعد علاقائیت کی بنیاد پر تمام چھوٹی بڑی جماعتوں کے متحدہ متحاذ کی تشکیل کا عمل شروع ہوگا اور سندھی نیشنلزم کا یہ متحدہ محاذ سندھی آبادی کو سیلاب کی طرح بہالے جائے گا۔

فوجی حکمرانوں کے عزائم یہ نظر آتے ہیں کہ سندھی نیشنلزم کی تحریک کو قوت کے ذریعہ آسانی سے کچلا جاسکے گا لیکن اس طرح سے ملک کو انارکی اور خانہ جنگی سے کسی طور بچایا نہیں جاسکتا۔ عوام کے تعاون اور ان کے احساس شرکت کے بغیر محض قوت سے ملک کی سلامتی دشوار ہی نہیں قریب قریب ناممکن ہے۔

معاشی طور پر ہمیں یہ نکتہ سمجھنا ہوگا کہ مسئلہ محض سرکاری ملازمتوں کا نہیں ہے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ ایسی معاشی پالیسیاں اختیار کی جائیں جن سے معیشت کے مختلف شعبوں، صنعت حرفت تجارت اور ملازمت وغیرہ میں سندھیوں کی آبادی کی مناسبت سے شرکت یقینی ہوسکے۔ سندھی مسلمان ہندو اور انگریز کی سازش سے اگر قیام پاکستان سے پہلے معیشت کے تمام شعبوں میں پس ماندہ رہا تو اس کی سزا موجودہ نسل کو نہیں ملنی چاہیئے۔ پھر وفاق پاکستان کا استحکام ہی اس بات سے وابستہ ہے کہ پسماندہ علاقوں اور لسانی اکائیوں کو خصوصی پلاننگ کے ذریعے ترقی پذیر علاقوں کی سطح تک لایا جائے۔ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ سندھی آبادی کی اکثریت کی بستیوں میں صنعتی مراکز قائم کئے جائیں لیکن اس کے لئے پہلے لیبر اور مینجمنٹ کی ٹریننگ کے لئے ٹریننگ مراکز قائم کیے جائیں جہاں مقامی آبادی کو صنعت کاری کی ٹریننگ دی جائے۔ اسی طرح جو انڈسٹریاں سرکاری شعبہ میں لگائی جائیں وہ مستحکم ہونے کے بعد مقامی آبادی کو (جو سرمایہ فراہم کریں) فروخت کردی جائیں۔ ہمارے ہاں پی آئی ڈی سی کا قیام اس مقصد کے لئے ہوا تھا کہ وہ صنعت کاروں کو صنعتوں کے قیام میں ان کی حوصلہ افزائی کریں اور جہاں ممکن ہو، خود انڈسٹری لگائی جائے مستحکم ہونے کے بعد وہ نجی شعبہ کے حوالے کی جائے۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھی آبادی مزاجاً انڈسٹری کے لئے مناسبت نہیں رکھتی۔ یقیناً اس سلسلہ میں سندھی وڈیرہ نہایت نااہل ثابت ہوا ہے لیکن متوسط طبقے سے اب ایسے مالدار افراد

پیدا ہونے شروع ہو گئے ہیں جنہیں اگر انڈسٹری لگانے کے لئے خصوصی مراعات اور مواقع دیئے دیئے جائیں تو اس معاملہ میں کافی پیش قدمی ہو سکتی ہے ۔ اس طرح رفتہ رفتہ سندھی آبادی میں صنعت کار بھی پیدا ہو سکتے ہیں تو بڑھتی ہوئی سندھی آبادی کی معاشی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں ۔ کمزوریاں مواقع دینے سے ہی دور ہوتی ہیں اور صلاحیتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ۔ مثلاً قیام پاکستان سے پہلے ہندوستان کی کئی سو ملوں اور کارخانوں میں مسلمانوں کی مشکل سے دس بارہ ملیں تھیں ۔ انہی مسلمانوں کو ہجرت کے بعد جب پاکستان میں حکومتی سطح پر مواقع فراہم کئے گئے تو صنعت کے سلسلے میں ان کی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آگئیں ۔

ان سیاسی اور معاشی اقدامات سے سندھ کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو جائے گا ۔ البتہ نظریاتی اور فکری محاذ پر لادینی قوتوں کی شکست کے لئے بڑے پیمانہ پر کام ہونا ضروری ہے ۔ میری رائے ہے کہ اگر سندھ میں آج بھی ایسے چند افراد ہی پیدا ہو جائیں جو صاحب دل اور صاحب نظر ہوں یعنی خدا سے والہانہ عقیدت رکھنے والے بھی ہوں تو جدید دور کی علمی و عملی تحریکوں اور اسلام کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا کامل شعور رکھنے والے بھی، تو اب بھی نظریاتی طور پر سندھ میں اسلام کے تحفظ و فروغ کا کام ہو سکتا ہے ۔ اور اسلام پر سندھی نوجوانوں کے اعتماد کو بھی بحال کیا جا سکتا ہے ۔ اس لئے کہ تاریخ میں اسلام کے تحفظ کا کام ہمیشہ درویش صفت بوریہ نشین افراد نے ہی کیا ہے ۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور چیز جس سے استحکام پاکستان کے لئے راہ ہموار ہو گی ۔ وہ دانشوروں، صحافیوں اور اہل علم کی سطح پر بین الصوبائی رابطہ ہو گا ۔ اگر پنجاب سے صحافی، دانشور اور اہل علم حضرات سندھ کے مطالعاتی دورے کے لئے وقت نکال سکیں اور اس پروگرام کو باقاعدہ ایک متحرک شکل دی جائے تو اس کے نہایت مفید اثرات ظاہر ہوں گے ۔ جس سے جہاں قومی سطح پر سندھ کی علاقائی ذہنیت اور مسائل کو سمجھنے میں مدد ملے گی وہاں انتہا پسندانہ رجحانات میں کمی بھی واقع ہو گی ۔

آخر میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہونے اور مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے ۔ خراب سے خراب حالات میں بھی صحیح راہ کی نشاندہی کرنے اور حالات کو بہتر بنانے کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ کوشش جاری رہنی چاہیئے ۔ لسانی اکائیوں اور قوموں کی زندگی میں بعض اوقات ایسی لہریں بھی آجاتی ہیں جن میں قوم جذبات کے بہاؤ میں ایک ہی رُخ

پر بہی چلی جاتی ہے لیکن اس کی مثال طوفان کے وقتی حملوں اور تند سیلاب کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے بعد جلد ہی صورت حال معمول پر آجاتی ہے۔ اگر ہم نے سندھ کے مسائل اور رجحانات کو سمجھنے سمجھانے کا ہی معرکہ طے کر لیا اور یہ آواز شدت کے ساتھ پنجاب سے اٹھنا شروع ہو جائے کہ سندھی بھائیوں کو قومی زندگی کے ہر شعبے میں برابر کی بنیاد پر ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کی جائے۔ اور ان کی سیاسی اور معاشی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے صورت حال میں کافی تبدیلی واقع ہونا شروع ہو گی۔

(۳)

تاریخِ سندھ پر طائرانہ نظر

از سید غلام مصطفےٰ شاہ

گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں سندھی دانشور سید غلام مصطفیٰ شاہ کے ایک مضمون کو روزنامہ "ڈان" کراچی سے بزبان انگریزی اخذ کیا گیا تھا اور ارادہ تھا کہ اگلے ماہ اس کا اردو ترجمہ بھی ہدیہ قارئین کر دیا جائے گا۔ لیکن دیگر مضامین کی اہمیت کے باعث یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اس بار بھی اس کے ابتدائی حصے کو ہی شامل کیا جا سکا ہے..... باقی انشاءاللہ آئندہ..... اقتدار احمد۔ مترجم

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

سندھ کا نام "سندھو" سے ماخوذ ہے جس سے دریائے سندھ موسوم ہے اور تاریخی طور پر اس میں کشمیر سے بحر ہند تک پھیلی ہوئی پوری وادی سندھ شامل تھی۔ موجودہ سندھ کی جغرافیائی حدود مغرب میں بلوچستان، صحرائے کیرتھر اور ہالار کے سلسلہ کوہ سے، شمال میں سبی اور بگسٹی سے، شمال مشرق اور مشرق میں بہاولپور اور راجھستان سے اور جنوب میں بحر ہند سے محیط ہیں۔ صوبے کے رقبے کو تین منطقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ منطقہ وسطی جو دریائے سندھ کی گذر گاہ ہے اور اس کی پھیلائی ہوئی زرخیز مٹی سے فیض یافتہ ہے، منطقہ شرقی جو ریتلے اور صحرائی علاقوں پر مشتمل ہے اور منطقہ غربی چھوٹی بڑی پہاڑیوں کے سلسلے کا نام ہے جو اس کی حد کے ساتھ ساتھ بحر ہند تک چلا جاتا ہے۔

ازمنہ قدیم سے ہی سندھ کے روابط ہندوستان کی نسبت مغربی سمت میں واقع ممالک سے زیادہ رہے۔ فی الحقیقت ہند اور سندھ مختلف علاقوں کے نام تھے۔ سندھ کے مراسم ہندوستان کے مقابلے میں جزیرہ نمائے عرب، عراق، ایران اور افغانستان سے زیادہ گہرے تھے۔ سندھ پر ہندوستان کے تسلط کا آغاز سلطنت دہلی کے زمانے میں ہوا لیکن یہ تسلط برائے نام، مخدوش اور غیر یقینی ہی چلتا رہا۔ یونانی مورخین کے ہاں یہ بات موضوع بحث رہی ہے کہ کیا دریائے سندھ ہی ہندوستان اور سندھو دیش کے مابین خط تقسیم نہیں ہے۔ فارس اور عرب کے سیاح اور جغرافیہ دان ہمیشہ اس خیال میں راسخ رہے کہ وادی سندھ ہندوستان اور اقلیم مغرب کے درمیان ایک غیر جانبدار پٹی کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ موہنجودڑو کا تہذیب و تمدن غیر آریائی اور اس کے ہندوستانی رنگ سے قطعاً مختلف تھا۔

سندھ ایک قدیم نخلستان ہے۔ اس کی تاریخ میں اڑھائی ہزار تا دو ہزار سال قبل مسیح ایک خلاء سا پایا جاتا ہے اور اس کے بعد ہی ہم تاریخ سندھ کے نسبتاً قابل اعتماد اور معروف حصے میں پہنچتے ہیں۔ فی الحقیقت سندھ کی تاریخ کا آغاز سن پانچ سو بیس تا پانچ سو پندرہ قبل مسیح میں ہوتا ہے جب فارس کے حکمران دارا اول نے فوج کشی کر کے سندھ کو سلطنت فارس میں شامل کر لیا تھا۔ دو صدی بعد سندھ پر سکندر اعظم کی یلغار ہوئی جس کے سفر اور عسکری مہمات کا ذکر یونانی مورخین نے محفوظ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم نے ہی موجودہ سیہون شریف کو آباد کیا تھا اور وہ اپنے سفر واپسی میں بلوچستان کے شہروں خضدار اور خاران سے بھی گذرا.....

موہنجودڑو کے آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ سندھ اس دور میں کچھ عرصہ یونانی منگولیائی اثرات کے تحت رہا۔ انہی دنوں میں کچھ مدت سندھ کے حکمران ماروی خاندان کے زیر نگین بھی رہے یہاں تک کہ سن ایک سو پچانوے قبل مسیح میں بلخ کی فتح کے بعد یونانیوں کی حکومت یہاں بحال ہوئی۔

یونانیوں کے بعد یہاں بحیرہ اسود کے شمال مشرق سے آنے والے قبائل چھائے رہے جو ترکی النسل تھے۔ بعدازاں لگ بھگ ایک صدی قبل مسیح موہنجودڑو کے آثار کے مطابق سندھ پر بدھ مت کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ بحیرہ اسود کے شمال مشرق سے آمدہ قبائل کی نقل و حرکت کا مرکز بھبور تھا اور انہوں نے بحر ہند کے ساحل کے ساتھ ساتھ پیش قدمی کی تھی۔ یہ لوگ اور انہی کی طرح کشن قبائل ترکی النسل تھے اور اسی باعث سندھ پر ترکی تہذیب کی چھاپ بھی لگی۔ خاندان کشن کے عظیم بادشاہوں میں سے ایک یعنی شہنشاہ کنشک بدھ مت کا محافظ بن کر اٹھا تھا جس مذہب نے ایک صدی قبل مسیح سے ایک صدی بعد مسیح تک سندھ میں خوب عروج دیکھا۔ شہنشاہ کنشک کے وارثین تخت میں سے ایک نے سندھ پر عملاً حکومت کی اور اس کے سکے موہنجودڑو سے برآمد ہوئے ہیں۔ یونانی بادشاہوں کے زمانے میں ترک تہذیب کے اثرات کو فروغ حاصل ہوتا رہا کے شواہد سیستان، قندھار اور سندھ میں پائے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر برہمنوں نے سندھ

کے حکمران خاندانوں کا قرب حاصل کر لیا اگرچہ عوام بدستور بدھ مت ہی کے پیرو کار رہے۔ ہن قبائل کے اقتدار فارس و سندھ کے دور میں ترک تہذیب کی بالادستی رہی اور نتیجۃً بدھ مت کو ہزیمت اٹھانی پڑی۔ شاہ نوشیرواں کے دور حکومت میں سندھ کو باقاعدہ طور پر سلطنت فارس کا حصہ بنالیا گیا یہ تیسری صدی عیسوی میں ساسانی سلطنت کے عروج کا شاخسانہ تھا۔ (باقی آئندہ)

(۴)

ایک وضاحت!

رحیم یار خاں سے ڈاکٹر عبدالخالق کا مراسلہ

برادر گرامی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اپریل ۸۷ء کے میثاق میں صفحہ ۵۵ پر ایک مضمون میرے نام سے شائع ہوا ہے عنوان ہے "سندھ کی صورتِ حال" رات صادق آباد میں ایک محترم دوست نے اس پر تبصرہ کیا تو میں نے ان سے کہا "میں نے سندھ کے حالات پر کوئی مضمون میثاق کو نہیں بھیجا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فروری میں سندھ کے دورے پر جا رہے تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ سندھ کے مسئلے پر آپ کے مضامین بہت طویل ہیں۔ آپ ان پر سندھ کے باسیوں کا ردِ عمل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ان کا خلاصہ بنائیے جو چار صفحات سے زائد نہ ہو۔ دورے سے پہلے یہ خلاصہ اہلِ علم کو تقسیم کرا دیجئے تبادلۂ خیال زیادہ مفید رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام میرے ذمہ لگا دیا اور مہلت بھی ایک رات کی ملی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے مضامین کو سامنے رکھا اور اپنی دانست میں ان کی تلخیص تیار کر کے دوسرے دن صبح کو ائیر سروس سے ڈاکٹر صاحب کو بھجوا دی۔ اتفاق سے یہ تحریر ڈاکٹر صاحب کو وقت پر نہ مل سکی اور مجوزہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔

آج صبح میں نے میثاق دیکھا تو چار صفحے کا وہ خلاصہ میرے نام سے موجود تھا۔ ریکارڈ کی درستی کے لئے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون کے خیالات تو صد فی صد اور الفاظ و تراکیب بھی بیشتر آپ کے سلسلۂ مضامین سے ماخوذ ہیں۔ میں نے ایک طالب علم کی طرح ان کی تلخیص کی ہے۔

آپ کا مخلص

عبدالخالق

(۵)

پنجاب کی فریاد

محمد حنیف سلیمی (کراچی)

میثاق جنوری ۱۹۸۷ء کے شمارہ میں محترم حسن احمد صدیقی کراچی کا مراسلہ پڑھا۔ میرے محترم بھائی کو شاید کسی نے درغلایا ہے اور غلط حقائق مہیا کر دیئے۔ اصل حقیقت کچھ یوں ہے کہ آخری مردم شماری کے مطابق پنجاب کی آبادی پاکستان کی کل آبادی کا ۵۹-۶ فی صد ہے۔ اس حساب سے مرکزی حکومت میں پنجاب کا کوٹہ ۵۹ فیصد ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اسلام آباد کی آبادی کو بھی ملا کر پچاس فی صد کوٹہ مختص کیا گیا ہے یہ سراسر پنجاب کے نوجوانوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب کے لوگ مختلف محکموں میں کتنے فی صد کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر میں غلط بیانی سے کام کروں تو آخرت میں ہاتھ آپ کا اور گریبان میرا ہوگا۔

بھائی صدیقی صاحب نے فرمایا ہے کہ پی آئی اے اب پنجاب ائرلائن کہلوانے لگی ہے میں پی آئی اے کے سٹیٹسٹکس اور پرسانل ریکارڈ سیکشن کے ریکارڈ کے مطابق۔ پنجابیوں پچاس فی صد کوٹے کے حساب سے ۸۸۱۳ ملازم ہونا چاہیئے تھے۔ مگر ۶۹۵۸ کام کر رہے ہیں۔ یعنی ۵۰ فی صد کے بجائے صرف ۳۹٫۵ فی صد کام کر رہے ہیں۔ ۰٫۵ فی صد کم۔

کوٹہ کے مطابق سندھ شہری کے ۱۳۴۰ ملازم ہونا چاہیئے تھے مگر ۵۴۲۲ افراد کام کر رہے ہیں۔ یعنی اپنے حصے سے ۴۰۴٫۶ فی صد زیادہ ہیں۔ یعنی پی آئی اے کی پوری نفری ۷٫۶ فی صد کے بجائے ۳۰٫۸ فی صد ہیں۔ سندھ دیہی کے ۲۰۰۹ کی بجائے ۱۹۱۳ افراد کام کر رہے ہیں۔ یعنی صوبہ سندھ کے دیہی اور شہری کوٹے کو ملا کر ۳۳۴۹ افراد کے بجائے ۶۴۳۵ افراد کام کر رہے ہیں۔ اس طرح سے اپنے کوٹہ سے ۸۹٫۲ فی صد زیادہ ہیں۔ یکم دسمبر ۱۹۸۶ء تک کے اعداد و شمار

کے مطابق صوبہ سرحد کے ۲۰۷۷ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۱۷۰۰ افراد کام کر رہے ہیں یعنی ۳۲۰ کم - اسی طرح بلوچستان کے ۶۱۷ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۴۵۴ افراد کام کر رہے ہیں یعنی ۱۶۳ کم، اور پسماندہ علاقوں کے ۷۰۵ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں صرف ۱۲۷ افراد کام کر رہے یعنی ۵۷۸ افراد کم - اور ان سب کی کمی کو سندھ (شہری) کے ۱۳۴۰ افراد کے کوٹے کے مقابلے میں ۵۴۲۲ یعنی کوٹے سے ۴۰۸۲ افراد زائد بھرتی کر کے پورا کیا گیا ہے -

ایک وضاحت کر دوں کہ پنجاب کے افراد میں کم و بیش ۲۵/- فی صد بوگس ڈومیسائل والے بھی ہیں - کیونکہ پنجاب سے ڈومیسائل حاصل کرنا بہت آسان ہے جبکہ دوسرے صوبوں میں ایسا نہیں ہے -

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا - بھائی صدیقی صاحب ناراض نہ ہوں بقول ڈاکٹر اقبالؒ -

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

۱۹۷۴ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۶ء تک پی آئی اے میں پنجاب سے ۴۱۱ کے بجائے ۴۰۶ افراد بھرتی ہوئے - یعنی ۱۶۲ فی صد کم -

سندھ شہری سے ۶۲ کے بجائے ۱۷۳۱ افراد بھرتی ہوئے یعنی ۱۷۹ فی صد زیادہ -

اس خط لکھنے کا مطلب صرف اپنے بھائیوں کی غلط فہمی دور کرنا ہے - پنجاب کے خلاف صحافت کی یکطرفہ ٹریفک چل رہی ہے - اور پنجاب کو بلیک میل کیا جا رہا ہے - کراچی کے پریس والے ہمارے خطوط نہیں چھاپتے - آپ سے گذارش ہے کہ میرا خط مبشاق کے کسی شمارہ میں ضرور شائع کر دیں -

پاکستان اسٹیل ملز میں اس وقت ۲۲۴۱۶ افراد کام کر رہے ہیں - جس میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے صرف ۵۲۱۹ افراد ہیں اس طرح اسٹیٹ بنک، نیشنل بنک، یک اک، نیشنل شپنگ کارپوریشن، کراچی شپ یارڈ، میرین اکیڈمی، غرضیکہ پاکستان میں کسی بھی مرکزی حکومت کے ماتحت ادارے میں پنجابی ۲۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہیں - پنجاب کو کھایا بھی جا رہا ہے اور بدنام

بھی کیا جارہا ہے۔ بقول آپ کے پنجاب والے شکایت بھی کریں تو کسی سے کریں۔ شاید یہ نفسیاتی طور پر ڈرے ہوئے ہیں کیونکہ ان پر قدیم زمانے سے بہت سی طاقتیں حملہ کرتی چلی آرہی ہیں۔ اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتی رہی ہیں۔

مسئلہ کا حل ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب آبادی بڑھنے لگے تو نیا شہر یا بستی آباد کرلیا کرو۔ کراچی کی آبادی میں اضافے کو روکنے کے لئے دوسرے شہروں میں صنعتیں لگائی جائیں۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان، ڈیرہ غازی خان، جہلم، میانوالی، بھکر، حبیب آباد، دادو وغیرہ اگرچہ اس کام کے لئے زیادہ عرصہ درکار ہوگا لیکن دیرپا حل یہی ہے۔ فوری حل کیلئے گذارش ہے کہ مرکزی حکومت کے تحت جتنے ادارے ہیں اُن کے صدر دفاتر ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق دارالحکومت میں منتقل کردیئے جائیں مثلاً تمام بنک، پی آئی اے، ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن پک اک، نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن وغیرہ۔ اس سے کافی حد تک کراچی میں آبادی کا دباؤ کم ہوجائے گا۔

محمد حنیف سلیمی کراچی

THE ROARING LION OF AGRO-CHEMICAL INDUSTRY

BUBBER SHER UREA ®

THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS. AND THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS WELL.

AT DAWOOD HERCULES WE DO THINGS WELL ! RIGHT FROM OUR INCEPTION 12 YEARS AGO WE'VE BEEN ENGAGED IN A TREMENDOUS OUTPUT, ENSURING BETTER AND HEALTHIER CROPS AND STRENGTHENING THE NATIONAL ECONOMY. DURING THIS TIME WE'VE :

a. PRODUCED 4,000,000 TONS OF BUBBER SHER UREA.
b. SAVED MORE THAN US $ 750,000,000 IN FOREIGN EXCHANGE FOR PAKISTAN.
c. CONTRIBUTED RS. 2000,000,000 TO THE NATIONAL TREASURY IN THE FORM OF DEVELOPMENT SURCHARGE, DUTIES AND TAXES.
d. SAVED FERTILIZER SUBSIDY WORTH RS. 3000,000,000 IN OUR PRODUCTION WHICH WAS USED BY THE GOVERNMENT TO SUBSIDIZE FERTILIZER PRICES, GIVING AN ENORMOUS BENEFIT TO THE FARMER.

BROADLY SPEAKING WE ARE COMMITTED TO A BETTER QUALITY OF LIFE FOR OUR PEOPLE AND WE ARE DEVOTING OUR VAST TECHNOLOGICAL RESOURCES AND AGRO-CHEMICAL KNOW-HOW TO PROVIDING A VITAL INPUT FOR DEVELOPING HEALTHIER CROPS.

WE FEEL PROUD OF THESE ACHIEVEMENTS, AND SHALL CONTINUE TO PLAY OUR KEYROLE IN THE DEVELOPMENT OF AGRICULTURE AND ECONOMY OF PAKISTAN.

dh CHEMICALS

DAWOOD HERCULES CHEMICALS LIMITED
MAKERS OF BUBBER SHER UREA

DAWOOD CORPORATION LIMITED
DISTRIBUTERS OF BUBBER SHER UREA

promoters

"گھٹتے جاتے ہیں مرے دل کے بڑھانے والے"

ایک بالغ نظر اور نکتہ شناس عالم دین

حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل

مولانا سعید الرحمٰن علوی

پاکستان کی شاہراہ اعظم (جی۔ ٹی روڈ) پر "نوشہرہ" ایک انتہائی اہم شہر ہے جو جغرافیائی اعتبار سے صوبہ سرحد کے ہیڈ کوارٹر ضلع پشاور کی تحصیل ہے' اسی تحصیل کا ایک گاؤں "زیارت کاکاصاحب" ہے۔ جو صوبہ سرحد کے ایک گرامی قدر شیخ طریقت "حضرت رحمکار کاکا" کی آخری آرام گاہ ہے انہی کی اولاد کاکاخیل کہلاتی ہے جس کا مرکزی علاقہ یہی جگہ ہے گو کہ وہ پھیلی ہوئی مختلف شہروں اور دیہات و قصبات میں ہے۔ اس عظیم المرتبت شیخ طریقت کے خاندان میں ایک وہ بزرگ عالم تھے جو ۲۳ر اپریل ۱۹۸۷ء کو حسن ابدال کے قریب اپنی کار کے حادثہ میں شہید ہو گئے اور ان کے اکلوتے فرزند سید معین الدین' جو کالج کے استاذ تھے اور گاڑی چلا رہے تھے' وہ بھی موقعہ پر ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کئے

معین میاں' میرے بہت ہی محترم بزرگ سید عبدالقدوس قاسمی کے داماد تھے' وہی مولانا عبدالقدوس جنہوں نے دیوبند سے لے کر اورینٹیل کالج لاہور اور اسلامیہ کالج پشاور میں علم کے موتی لٹائے اور آخر میں پاکستان کی شرعی عدالت کے جج بن کر گراں قدر خدمات انجام دے کر ریٹائرڈ ہوئے۔ مولانا قاسمی اور ان کا پورا خاندان علم و فضل میں اپنی روایتی حیثیت کا مالک ہے' دارالعلوم دیوبند اور اس کے گرامی مرتبت استاذ' جانشین شیخ الہند مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ سے کسب فیض کیا۔ مولانا قاسمی کے البتہ ایک بھائی محترم قاضی حسین احمد صاحب ایسے ہیں جو دیوبند کی علمی و تحریکی روایات سے الگ تھلگ مولانا سید ابوالاعلیٰ کی جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں اور آج کل اس کے جنرل سیکرٹری (قیم) ہیں۔

مفتی سیاح الدین صاحب حرمین شریفین کے سفر کے لئے گھر سے آرہے تھے اور اسلام آباد ایئر

پورٹ سے چند گھنٹہ بعد انہوں نے جدہ کے لئے فلائی کرنا تھا جہاں انہیں ایک کانفرنس میں شرکت کرنا تھی اور پھر حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہونا تھا لیکن اللہ رب العزت نے انہیں شہادت کی موت سے سرفراز فرما کر اپنے جوار میں بلالیا اور انہیں اپنی رحمت خاص کا مستحق بنالیا۔ مفتی صاحب تحریک آزادی کے مسلمہ رہنما حضرت الامام شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ (دیوبندی) کے خادم خاص حضرت مولانا عزیر گل سے عزیزداری کا بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے برادر عزیز مولانا نافع گل رحمہ اللہ تعالیٰ، جو دیوبند کے نامی گرامی اساتذہ میں سے تھے کی سرپرستی و معیت میں دیوبند کے مدرسہ میں گئے، یہ جنوری ۱۹۳۴ء کی بات ہے کتابوں کی تکمیل کر کے ۱۹۳۷ء میں امتیازی حیثیت سے دورہ حدیث کا امتحان دیا اور کلاس میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کر کے اپنے استاذ سے سند حدیث اور انعام حاصل کیا۔ ان کی باقی تعلیم اپنے حقیقی نانا سید مظہر حسین صاحب، مولانا قیاس گل صاحب اور مولانا قاضی عبدالسلام صاحب (خلیفہ ارشد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) کے یہاں ہوئی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے اٹک اور پشاور و مردان کے بعض مقامات پر تعلیمی خدمات سرانجام دیں، اسی اثناء میں ان کی ملاقات سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے ہوئی ان کے مشورے سے انہیں اٹک کے اُس پار کی پہاڑیوں سے نکل کر اِس پار کے کھلے میدانی علاقے میں آکر خدمت کا میدان فراہم کیا۔ سب سے پہلے شمالی پنجاب کے قدیم تاریخی قصبہ بھیرہ کا رخ کیا، بھیرہ میں بگوی خاندان کے ہونہار فرزند مولانا ظہور احمد نقشبندی نے انہیں اپنے مدرسہ کے لئے دعوت دی..... یہ مدرسہ جو دارالعلوم عزیزیہ کے نام سے اب تک جاری ہے، اسی خاندان کے بزرگ مولانا عبدالعزیز بگوی کے نام سے منسوب تھا، یہ حضرات حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور حضرت شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی رحمہما اللہ تعالیٰ کے براہ راست شاگرد اور فیض یافتہ تھے، اس خاندان کا علمی مقام بہت بلند تھا۔ ۱۹۴۲ء میں مفتی صاحب ان کی دعوت پر بھیرہ پہنچے اور ۱۹۴۰ء تک وہاں رہے۔ درمیان میں چھ ماہ کا عرصہ ۱۹۴۳ء میں مفتی صاحب نے مولانا قاری محمد طیب رحمہ اللہ تعالیٰ کی دعوت پر دیوبند میں گذارا۔ بھیرہ کے قیام کے زمانہ میں درس و تدریس اور افتاء کا فرض موصوف نے انجام دیا اور ساتھ ہی وہاں کے علمی تبلیغی مجلہ شمس الاسلام کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے، بلکہ شمس الاسلام کی ادارت کا سلسلہ تو بھیرہ سے واپس آنے کے بعد بھی ایک عرصہ جاری رہا۔

بھیرہ سے واپسی پر آپ مدرسہ اشاعت العلوم لائل پور (حال فیصل آباد) کی انتظامیہ کی دعوت پر فیصل آباد آگئے یہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کا قصہ ہے اور پھر دم واپسیں تک اس مدرسہ سے آپ کا تعلق قائم رہا۔ ۱۹۸۳ء تک تو باقاعدہ اور اس کے بعد اسلام آباد منتقل ہو جانے کے سبب سرپرستی کا۔ مفتی

صاحب مرحوم بنیادی طور پر علم کی خاموش وادی کے فرد تھے' ان کے اصل جوہر اسی میدان میں کھلتے' تاہم اجتماعی حالات کی بہتری کے لئے انہوں نے اپنے لئے " جماعت اسلامی " کی تنظیم اختیار کی ایسا کیوں کیا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں اور نہ میں نے کبھی ان سے اس موضوع پر بات کی تھی' تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان کا جماعت سے باقاعدہ تعلق رہا۔ اسی تعلق کے حوالہ سے انہوں نے ۱۹۷۰ء کا ہنگامہ خیز انتخاب فیصل آباد کی سیٹ سے لڑا جس میں ان کے علاوہ مولوی محمد ضیاء القاسمی (جمعیت علماء اسلام) مسٹر رفیق سہگل (جمعیت علماء پاکستان) بھی تھے لیکن کامیابی کا سہرا مسٹر مختار رانا کے سر بندھا جو چیئرمین بھٹو کے جانثار رفیق تھے اور سب سے پہلے وہی بھٹو صاحب کے ستم کا نشانہ بنے کیوں کہ اپنی انقلابی سوچ اور طریق کار کے پیش نظر وہ جاگیردار بھٹو کا ساتھ نہ دے سکے۔ جماعت اسلامی ۱۹۷۰ء کے الیکشن کے سلسلہ میں بہت ہی پرامید تھی اور اس کو یقین تھا کہ اگر اس کی حکومت نہ بنی تو موثر ترین اپوزیشن وہ ضرور ہوگی۔ مگر انتخابات کے نتائج مایوس کن حد تک حوصلہ شکن نکلے۔ اور اس کے اکثر امیدوار بہت ہی کم ووٹ لے سکے جن میں مفتی صاحب مرحوم بھی شامل تھے' لیکن اس شکست کا ان پر ایسا کوئی اثر نہ تھا کیونکہ جس دنیا کے وہ فرد تھے' وہ سلامت تھی اور وہ اس میں پوری طرح منہمک تھے بلکہ انہوں نے ۱۹۸۳ء میں جماعت اسلامی سے وابستہ مدارس کی اجتماعی تنظیم " رابطہ المدارس " قائم کی اور اپنے حلقہ کے مدارس کی تعلیم' نصاب تعلیم اور امتحان وغیرہ کو یونیورسٹی اصولوں پر منظم کرنے کی سعی کی۔ اس تنظیم کے وہ بانی صدر تھے اور اپنی موت تک اس کے صدر رہے۔ بلکہ اپنے آخری دنوں میں اس حوالہ سے بہت سی تقریبات میں شرکت کی۔

مسز ضیاء الحق جیسے جونیئر فوجی افسر کو مسٹر بھٹو نے عنایت خسروانہ سے فوج کا سربراہ بنایا لیکن انہوں نے بھٹو صاحب کو چلتا کر کے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور اسلام کی خدمت کو اپنا نعرہ قرار دیا ۱۰ برس کی ان کی " اسلامی خدمات " کا جو حال ہے وہ سب کے سامنے ہے؟ ہم نے محسوس کیا کہ جس طرح بھٹو صاحب نے " سوشلزم " کا پنڈورا کیا اس طرح اس شریف انسان نے اسلام کے سلسلہ میں حشر کر دیا اور اب ڈر ہے کہ اس کے نتیجہ میں کوئی نئی قیامت نہ سر آ پڑے..... بہرحال مسز ضیاء الحق نے برسر اقتدار آتے ہی اپنے نعرہ اسلام کو پروان چڑھانے کی غرض سے اسلامی نظریاتی کونسل' جس کی داغ بیل صدر ایوب خان مرحوم نے ڈالی تھی' کی از سر نو تشکیل کی۔ اس زمانہ میں قومی اتحاد کی لیڈر شپ سے مسز ضیاء کے گہرے تعلقات تھے۔ صدر اتحاد مولانا مفتی محمود رحمہ اللہ تعالیٰ کے تعاون سے انہوں نے کئی اہم حضرات کو اس کونسل میں شامل کیا جن میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری اور مولانا محمد تقی عثمانی شامل ہیں' مفتی سیاح الدین صاحب بھی اس سلسلے میں سامنے آئے مفتی محمود صاحب نے ان کے علمی رسوخ کے پیش نظر ان کے نام کی تائید کی اور جماعت اسلامی' ضیاء تعلقات

بھی کام آئے..... بہرحال مفتی صاحب کا یہ کریڈٹ ہے کہ انہوں نے خوب جی لگا کر کام کیا۔ ان کی علمی صلاحیتیں اس دور میں بھرپور طریق سے سامنے آئیں' وہ آخری وقت تک اس کونسل کے ممبر رہے اور ایک دنیا اس کی گواہ ہے کہ اس کونسل میں سب سے بڑھ کر ٹھوس کام مولانا سیاح الدین اور مولانا تقی عثمانی کا تھا۔ تقی صاحب کی بے پناہ صلاحیتوں کا مرحوم کی زبان سے اعتراف خود میں نے سنا اور بعد میں جب تقی صاحب منصب عدالت پر فائز ہو گئے تو اب گویا مفتی صاحب تنہا اس قافلہ میں ایسے شخص رہ گئے جو محنت و ہمت سے کام کرتے' نکتہ رس عالم کی حیثیت سے بھرپور انداز سے حصہ لیتے اور خاص طور پر مختلف معاملات کو ٹھوس تحریری شکل دینے میں اپنا اعلیٰ کردار ادا کرتے۔

ہر چند کہ مفتی صاحب جماعت اسلامی سے وابستہ تھے لیکن اپنے مرکز علمی دیوبند سے ان کی وابستگی لازوال تھی۔ اور اپنے اصل حلقہ سے اپنے تعلقات کو انہوں نے ہمیشہ نبھانے کی تدبیر کی.....

جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی کے علمی افکار پر دیوبند کے اکابر کی تنقید مسلمات میں سے ہے۔ بالخصوص شیخ الاسلام مولانا مدنی کے جو احساسات اس سلسلے میں تھے وہ ایک حقیقت ہے اور اسی وجہ سے جماعتی حلقوں کے احساسات بھی علمائے دیوبند کے بارے میں بڑے شدید ہیں لیکن مفتی صاحب مرحوم نے اپنی سلامتی طبع کے باوصف عمر بھر دونوں انتہاؤں میں توازن اور اعتدال پیدا کرنے کی سعی کی۔

میں نے ۱۹۶۰ء میں انہیں پہلی مرتبہ دیکھا جب اپنے برادر بزرگ مولانا عزیز الرحمٰن خورشید سمیت مدرسہ عربی خیر المدارس ملتان میں زیر تعلیم تھا اس سال دیوبندی حلقہ کے مدارس کی وہ تنظیم قائم ہوئی جسے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج مدارس اسلامیہ کی سند اور فضلاء مدارس اسلامیہ کو جو تھوڑی بہت مراعات حاصل ہیں اس کا کریڈٹ اسی تنظیم کی طویل جدوجہد کو جاتا ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی بعد میں تنظیم المدارس (بریلوی) وفاق المدارس السلفیہ وغیرہ کی تنظیمیں معرض وجود میں آئیں۔ مفتی صاحب اس اجلاس میں مدرسہ اشاعت العلوم فیصل آباد کے مہتمم مولانا حافظ حکیم عبدالمجید (نابینا) سمیت شریک ہوئے۔ وہیں ہم ان سے ملے چونکہ وہ بھیرہ رہ چکے تھے جو ہمارا آبائی وطن ہے اور جس مدرسہ میں مفتی صاحب نے چند برس کام کیا اس میں ۳۱ برس ہمارے دادا مرحوم حضرت الحاج الحافظ غلام یاسین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ نے کام کیا تھا اس لئے دونوں میں برادرانہ اور محبانہ مراسم تھے انہی کے سبب وہ بڑی محبت سے پیش آئے اور ہم اس وقت سے آخر تک برابر یہ سلسلہ قائم رہا۔ یہ درست ہے کہ جماعت اسلامی کی فکر سے ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا اور اب بھی ہے' ہم اس معاملہ میں مولانا سید حسین احمد مدنی' مولانا احمد علی لاہوری

اور مولانا غلام غوث ہزاروی جیسے مزرگوں کے نظریات کو درست اور صحیح سمجھتے ہیں لیکن مجلس اور سماجی حوالہ سے تعلقات کی دنیا بالکل مختلف ہے اور اس حوالہ سے ہم نے انہیں ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا انہوں نے بزرگانہ شفقت سے کام لیا۔

تواضع 'انکساری' دھیمی گفتگو اور محبت بھرا رویہ ان کی خوبیاں تھیں' علم ان پر ناز کرتا اور وہ ادق سے ادق مسائل میں بڑی سنجیدگی سے سائل کو مطمئن کرتے' افسوس کہ وہ اس طرح دنیا سے اٹھ گئے کہ ان کا جواں سال اکلوتا فرزند بھی ان کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی موت "طاب حیاً و طاب میتاً" کی مصداق ہے' خوب زندگی گذاری' شہادت کی موت سے سرفراز ہوئے اور وہ بھی ایسے وقت میں جب وہ ایک مقدس سفر پر روانہ ہو رہے تھے' حادثہ میں موقعہ پر ہی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ علامات ایسی ہیں کہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اپنے خصوصی کرم کا معاملہ فرمائے گا..... دنیا میں آنے والے ہر کسی کو جانا ہے لیکن علم کی وادی میں خاموش زندگی گذار کر اس طرح دنیا سے رخصت ہونا یقیناً بڑی سعادت ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بڑی اچھی توقعات وابستہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے فرزند سعید کو اپنی رحمتوں سے نوازے غم زدہ خاندان اور معصوم بچوں کا خود مربی و نگہبان اور ضامن و کفیل ہو..... سچ ہے.....

سچ ہے آخر کوئی کتنا ہی ہو صاحب کمال
حیّ و قیوم ہے اک فقط ذات رب ذوالجلال

☆

شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہر پنج پیری

وارث خان پشاور

شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان مرحوم کے بعد شیخ القرآن مولانا محمد طاہر پنج پیری کی رحلت سے حضرت مولانا حسینؒ علی کے دلستان توحید کا اک چراغ اور گل ہو گیا۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ط

ہر نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ لیکن بعض حضرات کی موت کافی عرصے

تک یاد رہتی ہے۔ انہی لوگوں میں سے ایک داعی توحید و سنت شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طاہر پنج پیری بھی تھے مرحوم ۱۹۱۳ء میں ضلع مردان کے گاؤں پنج پیر میں ایک معزز اور بااثر گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مولانا حسین علیؒ (واں بھچراں والے) اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے شاگرد رشید تھے۔ آپ ۱۹۳۴ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں آپ نے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے قرآن پاک کی تفسیر کا فیض پایا۔ وطن واپسی پر چند دینی مدارس میں درس و تدریس کے بعد اپنے گاؤں میں مدرسہ قائم کیا۔ مولانا مرحوم نے اُس وقت توحید و سنت کا علم بلند کیا جب سرحد میں شرک و بدعت اپنے پورے عروج پر تھی اس دوران آپ پر کئی بار قاتلانہ حملے بھی ہوئے۔ آپ کو پتھروں سے زخمی کر کے سُنّت طائف زندہ کی گئی۔ کیونکہ علمائے حق انبیائے کرام کے وارث ہوتے ہیں۔ اس لئے تکالیف اور مصیبتوں میں بھی انبیاء کی وراثت ملتی ہے۔ بقول مولانا محمد طیب کے (صاحبزادہ حضرت شیخ القرآن) غسل کے وقت مولانا کے جسم پر وہ پتھروں کے داغ اور زخموں کے نشان اب بھی موجود تھے۔ ان مصیبتوں اور تکالیف کے باوجود مولانا مرحوم نے توحید و سُنّت کی بات کا پرچم بلند کئے رکھا۔ اپنے اور پرائے بہت سے لوگ مولانا کے مخالف ہوئے۔ لیکن مولانا نے حق بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کی۔ مولانا مرحوم بہت بڑے مناظر بھی تھے اور عربی کے بہت اچھے انشاء پرداز بھی تھے۔ مولانا مرحوم کی اکثر تصانیف عربی زبان میں ہیں۔ مولانا مرحوم کو زیادہ تر فکر علمائے کرام کی اصلاح کی ہوتی تھی۔ آپ فرمایا کرتے۔ اگر علماء صحیح ہو جائیں۔ تو عوام الناس بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔

آپ کا اصل ہدف توحید و سُنّت کی دعوت و تبلیغ اور شرک و بدعت کا ابطال تھا۔ اس مقصد کے لئے مولانا نے ایک جماعت "جمعیت اشاعت التوحید والسنت" قائم کی۔ جس کے آپ امیر بھی تھے۔ ہر سال شعبان اور رمضان میں آپ کے دورۂ تفسیر میں اندرون ملک اور بیرون ملک سے ہزاروں حضرات شرکت کرتے تھے سامعین مولانا کا انفرادی انداز کے شیدائی تھے۔ آپ کے حلقۂ درس میں پانچ

پانچ سو عورتیں بھی شریک ہوتیں - آپ نے لاکھوں شاگرد تیار کئے - جو اندرون ملک اور بیرونِ ملک توحید وسنت کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں - آپ نے تقریباً پچاس سال تک توحید وسنت کی خدمت کی مولانا مرحوم کی جب ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی - تو مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو پنج پیر آنے کی دعوت دی - ڈاکٹر صاحب دسمبر ۱۹۸۳ء میں پنج پیر تشریف لے گئے اور وہاں مولانا مرحوم کے پاس ٹھہرے - اور درسِ قرآن دیا - جس کو مولانا مرحوم نے بہت ہی پسند کیا - مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو اپنا ذاتی کتب خانہ دکھایا اور اپنی چند کتابیں بھی تحفتہً عنایت فرمائی - ڈاکٹر صاحب نے مولانا مرحوم کو قرآن اکیڈمی لاہور آنے اور قرآن پاک کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی دعوت دی - جس پر مولانا اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اپریل ۱۹۸۴ء میں قرآن اکیڈمی تشریف لائے - اور ۲۷ اپریل کو جامع القرآن (مسجد قرآن اکیڈمی) میں خطبۂ جمعہ دیا - اور صلوٰۃ جمعہ پڑھائی - اور مختصر دورۂ ترجمۂ قرآن اور قرآنی سورتوں کا باہمی ربط وتعلق نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا - مولانا مرحوم کا گاؤں جہانگیرہ سے ۲۸ کلومیٹر دور صوابی ضلع مردان کے قریب ہے - مولانا کچھ عرصہ سے علیل تھے - وہ ان دنوں اپنے صاحبزادے میجر محمد حامد کے پاس راولپنڈی میں سی - ایم - ایچ ہسپتال میں زیرِ علاج تھے - کہ ۲۹ مارچ ۱۹۸۵ء کو رات ۱۰ بجے کے قریب دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا - اور وہ اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جاملے - (اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ) مولانا مرحوم کے دوسرے صاحبزادے مولانا محمد طیب اُن کے جانشین ہیں مولانا طیب صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی طرح علم وعمل کی دولت سے نوازا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محمد طیب اور مولانا مرحوم کے شاگردوں کو مولانا کے مشن کو چلانے اور غلبۂ دین کی جدوجہد کے لئے میدانِ عمل میں آنے کی توفیق عطا فرمائے - راقم کو اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کے جنازے میں شرکت اور میت کو اٹھانے کی سعادت نصیب فرمائی - مولانا کے جنازے میں آنے والے حضرات بسوں، ٹرکوں - کاروں، ویگنوں - پک اپ گاڑیوں میں اور پیدل آئے تھے - جنازے میں لوگوں کی تعداد ساٹھ ستر ہزار کے قریب تھی - جن میں پنجاب اور سرحد کے ہزاروں علمائے کرام

بھی شامل تھے۔ جنکی آنکھیں قانونِ فطرت کے مطابق آنسوؤں سے تر تھی۔ نمازِ جنازہ مولانا کے صاحبزادے مولانا محمد طیب صاحب نے پڑھائی۔ مولانا کی میت کو گھر سے جنازہ گاہ تک اور پھر آخری آرامگاہ تک کھلے منہ لایا گیا۔ جس راستے سے مولانا کی میت کو گزارا گیا۔ دونوں طرف ہزاروں لوگ مولانا کے آخری دیدار کے لئے کھڑے تھے۔ مولانا کو سپردِ خاک کرتے ہوئے۔ یہ شعر ذہن میں گھوم رہا تھا۔ ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مولانا مرحوم کی وفات کا یہ خلا پورا ہونا ناممکن ہے۔ مولانا کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔

اللہ تعالےٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ اور اُن کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

آخر میں مولانا کے متعلقین سے درخواست ہے کہ مولانا کی تصانیف کے ترجمے کا اہتمام کریں۔ تاکہ علماء حضرات کے ساتھ ساتھ عوام الناس بھی اُن سے استفادہ کر سکیں۔ اور مولانا کے لئے مزید صدقۂ جاریہ بنیں۔

منصور احمد بٹلا

کی وفات پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا تعزیتی خطاب

بموقع شام الہدیٰ کراچی، منعقدہ ۱۷ مارچ ۸۷ء

مرتب: شیخ جمیل الرحمٰن

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

حضرات و خواتین.....!

مجھے آج ایک معذرت سے اپنی گفتگو کا آغاز کرنا ہے۔ جن حضرات کو بھی درس و تدریس یا

خطاب وتقریر کا کچھ بھی تجربہ ہے' وہ یہ بات جانتے ہیں کہ کسی بھی درس یا خطاب سے قبل مدرّس یا مقرر یا خطیب کو کچھ نہ کچھ وقت اپنے ذہن کو مرتّب کرنے کے لئے درکار ہوتا ہے۔ لیکن آج عصر کی نماز کے بعد مجھے منصور احمد بٹلا مرحوم کے اچانک انتقال کی جو خبر ملی' اس نے شدید طور پر میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جس کی بناء پر اس وقت تک میری کیفیت یہ رہی ہے کہ میں اپنے ذہن کو آج کے درس کے لئے نہ صرف یہ کہ مرتّب نہیں کر پایا بلکہ اس سے پہلے ذہن میں کچھ تانا بانا تھا بھی تو وہ بھی بکھر کر رہ گیا ہے۔ خاص طور پر یہ کیفیت اس لئے بھی ہوئی جب یہ بات سامنے آئی کہ کل "شام" کی پوری نشست میں بٹلا صاحب موجود رہے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوا کہ ہماری یہ زندگی کتنی بے ثبات ہے جس پر ہم تکیہ کئے بیٹھے ہیں۔ کسی کے اچانک انتقال کی خبر پر کچھ دیر کے لئے اعصاب پر صدمہ اور ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ بڑی عارضی سی کیفیت ہوتی ہے اور بہت کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوں کہ ہمیں بھی ایک روز موت کا مزا چکھنا ہے' ہمیں بھی ایک دن موت سے ملاقات کرنی ہے اور یہ ملاقات دفعتہً اور اچانک بھی ہو سکتی ہے۔ اس عدم ادراک اور بے شعوری کا سبب یہ ہے کہ جیسے جیسے مادہ پرستی کا غلبہ بڑھتا جا رہا ہے' ویسے ویسے صدمہ کے اثرات واحساسات کے وقفہ میں کمی آتی چلی جا رہی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے کسی کے انتقال اور وہ بھی اچانک انتقال پر چند دن ضرور اعصاب پر صدمہ کا تأثر برقرار رہتا تھا۔ ہوتے ہوتے اب بات چند ساعتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور میرا خیال ہے کہ عام طور پر اب اس صدمہ کے اثرات کا معاملہ چند منٹوں تک رہ گیا ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی مصروفیات و مشغولات میں اسی طرح مگن ہو جاتا ہے جیسا کہ وہ پہلے تھا۔

مجھے خاص طور پر اس کا بھی صدمہ ہے کہ اگرچہ میں بھاگ دوڑ کر پہنچا کہ میں ان کی نماز جنازہ میں شرکت کر سکوں۔ لیکن محرومی رہی اس لئے کہ ہمیں اطلاع صحیح طور پر نہ پہنچائی جا سکی۔ ہمیں نماز جنازہ کا وقت ساڑھے سات بجے شب کا دیا گیا تھا جبکہ ان کی نماز جنازہ مغرب کی نماز کے فوراً بعد یعنی سات بجے کے لگ بھگ پڑھی گئی۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ میں پہنچا تو جنازہ مسجد سے نکلا ہی تھا لہٰذا کاندھا دینے کا موقع مل گیا۔

میرا اندازہ ہے کہ آپ میں سے اکثر حضرات مرحوم سے واقف ہوں گے شاید چند لوگ ایسے بھی ہوں جو اُن سے شخصی طور پر متعارف نہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں تمام شرکاء کی معلومات کے لئے منصور احمد بٹلا مرحوم کی شخصیت کے قدرے تفصیلی تعارف کے لئے چند کلمات عرض کروں.....

یقیناً بہت سے احباب جانتے ہوں گے کہ پنجابی سوداگران دہلی کے نام سے پاکستان کے چند بڑے شہروں خاص طور پر کراچی میں بڑی کثیر تعداد میں جو برادری آباد ہے' بٹلا صاحب مرحوم کا اس برادری سے تعلق تھا۔ ان کے والد مرحوم بھی مذہبی اور دینی مزاج کے انسان تھے لیکن بدقسمتی سے

وہ غلام احمد پرویز کے خیالات سے کافی متاثر ہو گئے تھے۔ اپنی جگہ انہوں نے جو کچھ سمجھا خلوص سے سمجھا اور انہوں نے پرویز صاحب کے ساتھ بھرپور عملی و مالی تعاون بھی کیا۔ بعد میں پرویز صاحب کے بعض نجی و ذاتی معاملات کے باعث ان کا ان سے اختلاف ہوا اور ان کا عملی تعلق پرویز صاحب کے ساتھ منقطع ہو گیا لیکن میری معلومات کے مطابق فکر کے لحاظ سے کوئی تغیّر نہیں آیا۔ واللہ اعلم

منصور احمد بٹلا مرحوم کا بچپن ہی سے بہت سی دینی تحریکوں کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ ان کے ذہن و فکر پر بھی یا تو اپنے والد ماجد کے زیر اثر یا جس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما ہو رہی تھی اس کے نتیجہ میں کچھ اثر پرویزیت کا تھا۔ لیکن جیسے جیسے ان کی عمر بڑھتی رہی اور ان کی خداداد صلاحیت پروان چڑھتی رہی ساتھ ہی ان کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا رہا تو ان کے افکار و نظریات میں بھی اصلاح اور ارتقاء کا عمل جاری رہا اور ان پر پرویزیت کے فکر کی ضلالت و گمراہی منکشف ہوتی چلی گئی۔ اس مجلس میں علیٰ روس الاشہاد میں اس بات کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں کہ میں گواہی دینا چاہتا ہوں کہ منصور بٹلا مرحوم پرویز صاحب کے افکار و نظریات سے کلیۃً رجوع کر چکے تھے۔

انہوں نے آٹھ دس سال قبل سے اپنے لئے بڑی گرم جوشی' بڑی محنت اور بڑے زر کثیر کے صَرف کے ساتھ جو مشن شروع کیا ہوا تھا وہ یہ تھا کہ علمی و عقلی اور سائنٹفک اسلوب اور انداز سے نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ایمان کی اصل حقیقت اور اس کے دنیوی و اُخروی ثمرات سے واقف کرائیں۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے انہوں نے بڑی عرق ریزی' بڑی محنت اور بے شمار کتابوں کے مطالعہ کے بعد "مطالعہ فطرت اور ایمان" کے نام سے سالہا سال کی کوششوں کے بعد ایک کتاب مرتب کی۔ [1] اس کتاب کی اشاعت سے قبل انہوں نے کتنے ہی علماء سے اس پر نظر ثانی کرائی اور کتنے ہی ادیبوں سے اس کی زبان کی اصلاح کرائی اور بالآخر طباعت و اشاعت سے قبل انہوں نے اس کتاب کو میرے حوالے کیا تھا کہ اگر تم اس میں کوئی فکری غلطی پاؤ تو اس کی اصلاح کر دو۔ میں نے بالاستعاب اس کتاب کا مطالعہ کیا۔ کتاب کا مضمون اور اسلوب بیان نہایت مدلّل و مؤثر تھا۔ البتہ اس میں کہیں کہیں غیر شعوری طور پر پرویز صاحب کے فکر کی کچھ جھلکیاں بھی آ گئی تھیں۔ چنانچہ جہاں جہاں مجھے اس کے آثار نظر آئے' ان کو میں نے وہاں سے نکال دیا۔ منصور احمد بٹلا مرحوم و مغفور نے پوری خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ میری اس اصلاح اور تصحیح کو قبول کیا۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کتابچہ میری سند کے ساتھ شائع ہوا۔

پھر منصور احمد بٹلا مرحوم کی بے نفسی کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اس کتاب کے کسی ایڈیشن پر

---

[1] ان کا نام شیخ حافظ محمد احمد بٹلا تھا اور ان کا دہلی اور پھر کراچی میں سوت گولے کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ (ج ر)

بھی اپنا نام شائع کرانا پسند نہیں کیا بلکہ اسے شائع بھی مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام کرایا۔ یعنی ناشر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس کتاب پر اپنا نام دینا گوارہ نہیں کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کتاب کی اشاعت پر ان کا تقریباً پانچ چھ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ کام خالصتاً لوجہ اللہ انجام دیا۔ نام ونمود والی بات اس میں کسی طرح شامل نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے[1]

اب میں چاہتا ہوں کہ ہم سب خلوص دل سے منصور احمد بٹلا مرحوم کی مغفرت کے لئے دعا کریں۔ خاص طور پر اس لئے بھی کہ نہ میں ان کی نماز جنازہ میں شریک ہو پایا اور نہ آپ حضرات میں سے کوئی شریک ہو سکا ہو گا۔

استدراک

ان ابتدائی کلمات کے بعد محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے نہایت الحاح و زاری اور سوز و گداز کے ساتھ بھائی منصور احمد بٹلا مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرائی۔ ڈاکٹر صاحب کے جذبات کا یہ عالم تھا کہ ان کی آنکھیں نم تھیں اور آواز میں انتہائی درد تھا..... خاکسار کی بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھائی منصور کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی اس تعزیتی تقریر میں "مطالعہ فطرت اور ایمان" نامی بھائی منصور بٹلا مرحوم کی جس کتاب کا ذکر ہے، بھائی منصور نے اس میں مزید اضافے کئے اور پھر اس پر مختلف علماء سے نظر ثانی کرائی۔ عالم اسلام کے مشہور عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی المعروف "علی میاں" سے اس پر نظر ثانی کرانے کے لئے لکھنؤ (بھارت) کے دو سفر کئے۔

علی میاں مدظلہ تو اس کتاب پر سرسری نظر ڈال سکے البتہ موصوف نے اپنے معتمد خاص جناب مولانا برہان الدین صاحب سنبھلی (استاذ تفسیر و حدیث ندوۃ العلماء) سے اس کا بالاستعاب مطالعہ کرایا اور پھر ان کی سند کے ساتھ اس کا نیا ایڈیشن "اللہ کا پیغام..... انسانوں کے نام..... بذریعہ پیغمبر علیہم السلام" نہایت

---

[1] اردو میں یہ کتاب ۹۰ ہزار کی تعداد میں اور سندھی میں ۱۰ ہزار کی تعداد میں شائع ہو کر ہدیۃً ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص کالج اور یونیورسٹیوں کے طلبہ اور پروفیسر صاحبان تک پہنچ چکی ہے۔ (ج ر)

خوبصورت گیٹ اپ اور ٹائٹل کے ساتھ کئی ہزار کی تعداد میں شائع کرائی..... ابھی اس کے دو سو نسخے ہی پریس سے آئے تھے کہ بھائی منصور احمد بتلا اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ ۱۶ر مارچ ۸۷ء کی شام میں منصور بھائی نے راقم الحروف سے طے کیا تھا کہ ۱۹ر مارچ ۸۷ء کو وہ مجھ سے ملیں گے اور اس کتاب کو پھیلانے کے لئے پروگرام بنائیں گے لیکن اجل مسمّٰی اس پروگرام پر خندہ تھی۔ خوشی اس پر ہے کہ مرحوم کی زندگی میں کتاب کے چند نسخے پریس سے آ گئے تھے جس کو دیکھ کر وہ بے انتہا خوش تھے۔ اللّٰھم اغفر لہ و ارحمہ

صاحبانِ ذوق اس کتاب کو پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۸۸ کراچی نمبر ۲ سے ھدیۃً طلب کر سکتے ہیں۔

جمیل الرحمن

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مراکز

سندھ بیرنگ ایجنسی، ۶۵ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز کراچی۔ فون ۷۲۳۳۵۸ / ۷۲۱۱۷۲

خالد برادرز۔ بالمقابل کے۔ ایم۔ سی ورکشاپ نشتر روڈ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ / ۷۳۲۹۵۲ / ۷۳۰۵۹۵

رفتار کار

صوبہ سرحد میں امیر تنظیم اسلامی کی دعوتی مصروفیات

شام الہدیٰ پشاور

مرتب: ملک وارث خان (پشاور)

درس قرآن کے مشہور پروگرام "الھدیٰ" کی کامیابی اور امیر محترم کے مخصوص جلالی انداز بیان نے عوام الناس میں جو بے پناہ شہرت حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں ملک کے مختلف حصوں میں امیر محترم کے دروس قرآنی کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ ان دروس میں لوگوں کی دلچسپی اور ذوق و شوق نے بعض مقامات پر "شام الھدیٰ" کے نام سے مستقل شکل اختیار کر لی جو کہ فکر قرآنی کے ابلاغ کا ذریعہ ثابت ہوئی۔

اس ضمن میں اہالیان پشاور کے پرزور اصرار پر امیر محترم دسمبر ۱۹۸۱ء میں پہلی مرتبہ پشاور تشریف لائے اور قرآن کریم کا درس دیا اور اس کے بعد امیر محترم کا پشاور کے ساتھ رابطہ مسلسل رہا۔

امیر محترم جب بھی پشاور تشریف لاتے رہے اہالیان پشاور نے ہمیشہ ان سے ماہانہ پروگرام کے لئے وقت نکالنے کی درخواست کی۔ جبکہ امیر محترم کی ذاتی رائے اور خواہش بھی یہی رہی ہے۔ لیکن تمام خواہشات اور کوششوں کے باوجود یہ پروگرام ترتیب نہ دیا جا سکا لیکن حال ہی میں جب امیر محترم ۶ر فروری کو متحدہ شریعت محاذ کے جلسے میں شرکت کے لئے پشاور تشریف لائے تو رفقائے پشاور نے اپنی اس دیرینہ خواہش کا پھر اظہار کیا جسے امیر محترم نے قبول فرما کر ماہانہ درس قرآن کا پروگرام "شام الھدیٰ" کے نام سے پشاور میں شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ جبکہ اس سلسلے کا پہلا پروگرام ۳ر مارچ ۱۹۸۷ء کو طے پایا لیکن دورہ لیبیا کی وجہ سے یہ پروگرام مقررہ تاریخ پر شروع نہ ہو سکا۔ بعد میں یہ درس قرآن ۳۱ر مارچ ۱۹۸۷ء کو ہونا طے پایا "شام الھدیٰ" کے اس سلسلے کا پروگرام پشاور میں نو تعمیر شدہ عظیم الشان اور جدید ترین کمیونٹی سنٹر میں منعقد کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس کی اجازت متعلقہ حکام سے حاصل کی گئی اور پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے پشاور کے رفقاء نے تیاریاں شروع کر دیں۔ درس قرآن کی مناسب تشہیر کے لئے بینر اور پوسٹر مختلف مقامات پر لگائے گئے اور مسجدوں میں ہینڈ بل وغیرہ تقسیم کئے گئے۔ جبکہ اس کے علاوہ تین سو دعوت نامے

چھپوائے گئے اور یہ کارڈ پشاور کی ممتاز شخصیتوں' علمائے کرام' یونیورسٹی اور کالجوں کے پروفیسر صاحبان کو دیئے گئے۔

"شام الھدیٰ" کے سلسلے کا پہلا پروگرام "حقیقت جہاد" کے موضوع پر تھا۔ امیر محترم اس پروگرام کے لئے بذریعہ وین تشریف لائے۔ راستے میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر دارلعلوم حقانیہ تشریف لے گئے۔ جہاں مشہور عالم دین جناب شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب دامت برکاتہم اور مولانا سمیع الحق صاحب سے ملے۔ کچھ وقت وہاں گذارنے کے بعد پشاور کے لئے روانہ ہوئے ۳۰ر مارچ کو رات آٹھ بجے امیر تنظیم اسلامی پشاور جناب اشفاق احمد میر صاحب کے گھر پہنچے۔ ۳۱ر مارچ کی صبح کو پشاور کے رفقاء سے ملاقات کا وقت طے تھا۔ رفقاء سے ملاقات کے بعد ڈاکٹر صاحب کسی مریض کی عیادت کے لئے ہسپتال گئے۔ چند رفقاء نے ۳۱ر مارچ کو پلے کارڈ اٹھا کر شہر میں امیر محترم کے پروگرام کی تشہیر کی۔ اور باقی رفقاء کمیونٹی سنٹر کے انتظامات کے لئے وہاں چلے گئے۔ اسی دن حزب اسلامی افغانستان مجاہدین کے امیر جناب انجینئر گلبدین حکمت یار صاحب سے ملاقات کا وقت مقرر تھا۔ موصوف افغانستان کے جہاد میں بہت زیادہ سرگرم عمل ہیں۔ عصر کے وقت امیر محترم چند رفقاء کے ساتھ جناب گلبدین حکمت یار کی دعوت پر ورسک کیمپ تشریف لے گئے۔ جو پشاور سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر دور ورسک ڈیم کے قریب ہے۔ وہاں پر امیر محترم نے عصر کی نماز کے بعد افغان مجاہدین سے جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر نصف گھنٹہ خطاب کیا اور افغان مجاہدین کے جذبہ ایمان کو جلا بخشی۔ مجاہدین کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی۔ خطاب کے اختتام پر چائے کا اہتمام تھا۔ چائے کے بعد وہاں سے پشاور روانہ ہوئے۔ پشاور میں خطاب کا وقت بعد از نماز عشاء مقرر تھا۔ عشاء کی نماز کے وقت لوگ کمیونٹی سنٹر میں آنا شروع ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے امیر محترم بھی وہاں پہنچ گئے۔ ٹھیک نو بجے امیر محترم کا خطاب شروع ہوا۔ جس میں تقریباً سات سو افراد شریک تھے۔ پروگرام میں پشاور کے علمائے کرام نے بھی شرکت کی۔ خطاب پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ جس میں امیر محترم نے حقیقت جہاد پر کافی جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی۔ باہر کتابوں کا سٹال بھی لگایا گیا تھا۔ جس سے لوگوں نے کافی کتابیں خریدیں۔ کمیونٹی سنٹر میں مردوں کے علاوہ چند خواتین بھی تشریف لائیں۔ جن کے لئے اوپر گیلری میں پردے کا انتظام کیا گیا تھا۔ قرآن اکیڈمی کے مدرس جناب الطاف الرحمٰن بنوی بھی تشریف لائے۔ اور اس دوران میں بنوں' سرائے نورنگ ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور میں دوسرے پروگرام کے لئے تاریخ مقرر کی گئی۔ پشاور کے لئے ۱۰ر اپریل' بنوں سرائے نورنگ کے لئے ۱۱ اپریل اور ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے ۱۳ر اپریل کی تاریخیں مقرر کی گئیں بعد میں امیر محترم اور جناب میاں نعیم صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ اور جدہ سے آئے ہوئے پشاور کے رفیق جناب افتخار الدین صاحب بھی آپ کے ہمراہ ہو گئے۔

اس پروگرام کے پوسٹر اور ہینڈ بل پشاور کے مشہور جالندھر سویٹ ہاؤس والوں نے شائع کئے۔ اس کے علاوہ تین سو (۳۰۰) دعوت نامے سعدیہ پرنٹنگ پریس کے مالک جناب سعید احمد جان نے چھاپے۔ اس پروگرام کے لئے دریاں اور کرسیاں وغیرہ جناب حاجی عبدالسمیع صاحب مالک صابرینہ ٹینٹ سروس نے عنایت فرمائیں۔ ہم ان تمام حضرات کے تہہ دل سے مشکور ہیں اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

چھ دن ، پانچ شہر

امیر تنظیم اسلامی کے دورۂ پشاور، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خان، جہلم، میرپور کی رُوداد

مرتب : غازی محمد وقاص

۴ر اپریل سے ۷ر اپریل تک تنظیم اسلامی کا سالانہ اجتماع لاہور میں منعقد ہوا - اسی موقع پہ امیر محترم کا صوبہ سرحد کے شہروں پشاور- بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا چار دنوں کا پروگرام طے ہوا اور واپسی پہ ایک دن جہلم اور ایک دن آزاد کشمیر کے شہر میرپور کے پروگرام کا اضافہ بھی کرلیا گیا یوں ایک ہفتے کا بھرپور دعوتی پروگرام ترتیب پاگیا - لاہور سے قیم تنظیم اسلامی جناب محمد نعیم صاحب اور اُسرہ مصطفےٰ آباد کے فعال رفیق جناب محمد اسحاق صاحب بھی شریک سفر تھے۔ اس دورے میں جہاں کہیں بھی امیر محترم کا خطاب ہوا - وہاں مکتبہ لگانے کی ذمہ داری راقم کے سپرد تھی - البتہ دورے کے اختتام پہ یعنی واپس لاہور پہنچنے کے بعد میاں نعیم صاحب نے حکم دیا کہ اس سفر کی روداد قلم بند کرنے کا فرض بھی مجھے ہی ادا کرنے پڑے گا -

راقم چونکہ اس کوچے کا فرد نہیں اس لئے تحریر کا حق تو کیا ادا ہوگا محض ادائے فرض اور تعمیل ارشاد کے طور پر یہ سطور قلم سے نکل رہی ہیں - مزید برآں چونکہ دوران سفر ذہن میں دور دور تک اس بات کا گمان بھی نہ تھا کہ اس سفر کی داستان لکھنے کا - مرحلہ بھی آئے گا اس لئے نہ تو کوئی تحریری یادداشت مرتب کی اور نہ اس انداز سے واقعات کو ذہن میں مرتب کیا کہ لکھتے وقت معاون ہو - ان اسباب کی وجہ

سے اگر قارئین کو تشنگی یا ربط کی کمی کا احساس ہو تو راقم کو معذور سمجھتے ہوئے درگزر فرمائیں۔

پشاور

جمعہ دس اپریل کو صبح سات بجے تنظیم کی ویگن میں قرآن اکیڈمی سے پشاور کے لئے سفر کا آغاز کیا کامرہ میں نماز جمعہ کی ادائیگی اور کچھ دیر آرام کرنے بعد سفر جاری رہا۔ نماز مغرب سے پون گھنٹہ قبل ہم پشاور کی جامع مسجد نمک منڈی پہنچ گئے۔ جہاں درس قرآن کا پروگرام تھا۔ امیر محترم باغ جناح لاہور میں جمعہ پڑھانے کے بعد بذریعہ ہوائی جہاز پشاور پہنچ چکے تھے۔ پشاور کے نوجوان فقاء انتظام و انصرام میں مصروف تھے۔

۱۰ر اپریل کے پروگرام کے لئے پشاور کی ایک عظیم الشان جامع مسجد مدنی نمک منڈی کے متولی جناب حاجی عبدالجلیل صاحب اور مسجد کے خطیب قاری فیاض الرحمٰن علوی سے بات کی گئی تھی۔ اس مسجد میں ایک مدرسہ بھی قائم ہے۔ جس میں درس نظامی کے علاوہ حفظ و تجوید کا بھی انتظام ہے۔ اس مدرسہ کے مہتمم جناب قاری فیاض الرحمٰن علوی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے کافی خوش الحانی سے نوازا ہے۔ ہم اس پروگرام کے انعقاد کے سلسلے میں جناب حاجی عبدالجلیل صاحب اور جناب قاری صاحب کے بہت شکر گذار ہیں۔ نماز جمعہ امیر محترم نے مسجد دارالسلام جناح باغ لاہور میں ادا کی۔ اور فوراً ایئرپورٹ روانہ ہو گئے اور وہاں سے پشاور کی فلائٹ پر تقریباً ۴ بجے کے قریب پشاور پہنچ گئے۔ رفقائے پشاور اپنے مکتبے کے ساتھ عصر کے وقت مسجد پہنچ گئے۔ عصر کی نماز کے بعد چار افراد پر مشتمل قافلہ میاں محمد نعیم صاحب کی سرکردگی میں پشاور پہنچا۔ مغرب کی نماز کے وقت امیر محترم اور جناب اشفاق احمد میر صاحب جامع مسجد مدنی نمک منڈی پہنچ گئے۔ جہاں پر سامعین پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ نماز مغرب جناب قاری فیاض الرحمٰن علوی کی اقتداء میں ادا کی گئی۔ نماز کے بعد قاری عبدالحلیم صاحب نے تلاوت قرآن پاک فرمائی۔ جناب قاری صاحب کا شمار پاکستان کے چند مشہور قراء حضرات میں ہوتا ہے۔ آپ اندرون ملک اور بیرون ملک حسن قرات کے مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ اور کئی بار اول پوزیشن حاصل کر چکے ہیں۔ تلاوت کے بعد جناب امیر محترم کا خطاب شروع ہوا۔ اس خطاب کا موضوع "توحید عملی کے تقاضے" تھا۔ امیر محترم نے اس موضوع پر کافی جامعیت کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ جو تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس میں حاضری

تقریباً آٹھ سو حضرات تک تھی۔ اس اجتماع میں کافی تعداد میں کتابیں اور کیسٹ فروخت ہوئے۔ اس اجتماع میں کافی تعداد میں علماء کرام اور خطیب حضرات نے شرکت کی۔ آخر میں قاری صاحب کے ساتھ چائے پی گئی اور جناب اشفاق احمد میر صاحب کے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

بنوں

ہفتہ گیارہ اپریل کو پشاور سے صبح ساڑھے سات بجے بنوں کیلئے سفر کا آغاز کیا۔ پشاور کے تین نوجوان رفقاء، وارث خاں صاحب، حافظ محمد مقصود اور شکیل احمد صاحب بھی ہمارے قافلے میں شامل ہوگئے ۔ بنوں کا دو روزہ پروگرام قرآن اکیڈمی کے سابق مدرس جناب الطاف الرحمٰن بنوی صاحب نے ترتیب دیا تھا اور اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے بھرپور کوششیں کیں اللہ تعالیٰ اُن کی مساعی جمیلہ کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور رجوع الی القرآن کی جس دعوت کا بیڑا انہوں نے اٹھایا ہے وہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔ خم کھاتی ہوئی پہاڑی سڑکوں کے سفر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گیارہ بجے ہم بنوں پہنچے تو مولانا الطاف الرحمٰن بنوی اپنے رفقاء کے ہمراہ ہمارے منتظر تھے ان سے وہاں ملاقات کے بعد بنوں شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ کافی پرانا شہر ہے۔ بنوں میں ایک جامع مسجد (شہید بابا مسجد) میں ہمارے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ تقریباً سوا بارہ بجے ہم وہاں پہنچے۔ کھانا کھایا اور کھانے کے بعد جامع مسجد حافظ جی (عید گاہ) کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں نماز ظہر کے بعد امیر محترم نے سورہ صف کا درس دو نشستوں میں مکمل کرنا تھا۔ بعد از نماز ظہر تقریباً دو بجے امیر محترم کا درس شروع ہوا۔ جو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہا۔ یہ مسجد کافی بڑی اور بہت قدیم تھی۔ درس کے اختتام پر لوگوں نے کتابیں خریدیں۔ اور پھر ہم اپنی قیام گاہ پہنچ گئے۔ وہاں نماز عصر ادا کرنے کے بعد مغرب تک مختلف حضرات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اس مسجد کے خطیب اور امام جناب لطف الرحمٰن صاحب نے بعد از نماز فجر ڈاکٹر صاحب کے درس کا اعلان کیا۔ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد جناب الطاف الرحمٰن بنوی صاحب کی سربراہی میں سرائے نورنگ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ جگہ بنوں سے ۲۵ کلو میٹر دور ہے۔ سرائے نورنگ پہنچے تو وہاں کے علمائے کرام باہر سڑک پر انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد وہاں چائے پی گئی جس کا انتظام ایک مڈل سکول میں کیا گیا تھا۔ چائے پینے کے بعد جامع مسجد اڈہ سرائے نورنگ میں نماز عشاء ادا کی گئی۔ بعد از نماز عشاء امیر محترم کا خطاب سیرت النبی صلعم کے انقلابی مراحل کے موضوع پر تھا۔ یہ خطاب تقریباً پونے دو گھنٹے تک جاری رہا۔ اس

خطاب کو سننے کے لئے تقریباً ڈھائی سو افراد موجود تھے۔ اس جگہ بھی کافی کتابیں فروخت ہوئیں۔

اتوار ۱۲ اپریل کو نمازِ فجر کے بعد جامع مسجد شہید بابا میں ڈاکٹر صاحب نے راہ ہدایت کا سہ نکاتی پروگرام کے موضوع پر سورہ آل عمران کی آیات ۱۰۱ تا ۱۰۳ کی روشنی میں آدھا گھنٹے کا درس دیا اختتام درس پر ناشتہ کیا۔ اور پھر آرام کرنے کے بعد ظہر کے کھانے کا انتظام قریب کے ایک صاحب جناب غلام رسول صاحب کے مکان پر تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جامع مسجد حافظ جی (عید گاہ) کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاں پر سورہ صف کے دوسرے حصہ کا درس ہوا۔ یہ تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ اختتام درس پر وہاں کے خطیب جناب حاجی عبدالقادر صاحب نے چائے کا انتظام کیا تھا۔ چائے کے بعد امیر محترم اپنی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ اور چند رفقاء مدرسہ معراج العلوم چلے گئے۔ امیر محترم بھی مغرب کی نماز کے بعد مدرسہ معراج العلوم تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں مہتمم جناب صدرالشہید صاحب جمعیت علمائے اسلام کے مشہور رہنما سے امیر محترم نے ملاقات کی۔ اور مختلف سیاسی و دینی موضوعات پر تبادلہ خیال کیا۔ مولانا صاحب نے کھانے کا پر تکلف اہتمام کیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد "پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا؟ کیوں؟ کیسے" کے موضوع پر تقریباً دو گھنٹے تک خطاب جاری رہا۔ حاضری تقریباً تین سو افراد تک تھی۔ خطاب کے بعد لوگوں نے کیسٹ اور کتابیں خریدیں۔ صبح بعد از نماز فجر سوال و جواب کی نشست جامع مسجد شہید بابا میں تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔ اس نشست کے بعد ناشتہ کیا گیا۔ ساڑھے دس بجے بنوں بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر امیر محترم نے استحکام پاکستان کے موضوع پر خطاب کیا۔ بعد میں مختصر سوال و جواب کی نشست ہوئی۔ آخر میں بار کی طرف سے چائے کا اہتمام تھا۔

ڈیرہ اسماعیل خاں

ٹھیک بارہ بج کر تیس منٹ پر ڈیرہ اسماعیل خان کے لئے روانہ ہوئے۔ جناب بنوی صاحب بنوں سے ۴۰ کلو میٹر دور تاجہ زئی کے مقام تک ہمارے ساتھ آئے اور وہاں ہم سے رخصت ہوئے۔ ہم ٹھیک سوا دو بجے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچے۔ ڈیرہ سے پانچ کلو میٹر باہر ہمارے رفیق جناب صادق صاحب ہمارے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سے ملاقات کے بعد کچھ آگے گئے تو جناب مولانا غلام رسول صاحب (مبلغ تحفظ نبوت اور خطیب جامع مسجد جمعہ شاہ) اور ان کے ساتھی موٹر کار پر ایک بینر لگائے کھڑے تھے۔ جس پر لکھا تھا۔ "ہم معزز مہمان جناب ڈاکٹر اسرار احمد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔" ان سے ملاقات کے بعد ہم جناب جہانگیر خان ایڈووکیٹ کے مکان پر پہنچے۔ جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد کھانا کھایا۔ اور آرام کے لئے اندر چلے گئے۔ جمعہ شاہ کی

جامع مسجد میں نمازِ عصر ادا کی وہیں غلام سبحانی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ موصوف کا تعلق اسی شہر سے ہے لیکن عرصہ بیس سال سے امریکہ میں مقیم ہیں۔ گذشتہ تین سال سے سعودی عرب میں گذارے۔ وہاں سٹرکچرل آرکیٹیکٹ کے طور پر کام کررہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے تحریروں سے بے حد متاثر ہیں۔ گذشتہ تین سال سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان گومل یونیورسٹی کے قریب ۴ کنال کا قطعہ اراضی انجمن خدام القرآن کے مقاصد کے لئے وقف کرنا چاہتے ہیں امیر محترم نے انہیں مشورہ دیا کہ آپ پہلے خود ابتدائی دینی تعلیم قرآن اکیڈمی حاصل کریں اور پھر اس جگہ پر قرآن اکیڈمی کی طرز کا ادارہ قائم کریں۔ چونکہ امیر محترم کا خطاب بعد نماز عشاء ہونا تھا۔ اس لئے امیر محترم، میاں محمد نعیم صاحب، چوہدری محمد اسحاق صاحب سبحانی صاحب کے ہمراہ مذکورہ جگہ دیکھنے چلے گئے۔

امیر محترم کا خطاب جامع مسجد جمعہ شاہ میں بعد از نماز عشاء مقرر تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد مولانا غلام رسول صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا مختصر تعارف فرمایا۔ اور ساتھ ہی ختم نبوت کے متعلق چند باتیں بیان فرمائیں۔ امیر محترم کی تقریر تقریباً ساڑھے نو بجے شروع ہوئی۔ جس میں انہوں نے "ختم نبوت اور اس کے عملی تقاضے" کے موضوع پر مفصل خطاب کیا۔ جو دو گھنٹے تک جاری رہا۔ شرکاء کی تعداد سات سو تک تھی۔ مسجد کے علاوہ باہر گلی میں بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ خطاب ختم ہونے کے بعد کافی تعداد میں تنظیم اسلامی کا منشور تقسیم کیا گیا۔ کافی تعداد میں کتابیں اور کیسٹ فروخت ہوئے۔ واپسی پر جناب جہانگیر خان صاحب کے گھر کھانا کھایا اور امیر محترم نے مختلف علمائے کرام سے تبادلہ خیالات کیا۔ صبح بعد از نماز فجر یہ قافلہ دو حصوں میں پشاور اور جہلم کی طرف روانہ ہوا۔

جہلم

ڈیرہ اسماعیل خان سے جہلم کا فاصلہ تقریباً چار سو کلو میٹر کا ہے۔ اس لئے صبح چھ بجے ڈیرہ اسماعیل خان سے کمر ہمت کسی اور اللہ کا نام لے کر سفر کا آغاز کیا۔ پشاور کے رفقاء نے پشاور کی طرف کوچ کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے روانہ ہوتے ہوئے راستے میں خانقاہ سراجیہ میں مولانا محمد خان صاحب سے شرف ملاقات کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔ راستے کی رہنمائی اور مولانا خان محمد سے ملاقات کی غرض سے محمد زاہد صاحب بھی شریک سفر ہو گئے۔ تقریباً ساڑھے دس بجے ہم خانقاہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ مولانا صاحب ہری پور کے لئے روانہ ہونے والے ہیں۔ ارادہ سفر کی مصروفیت کے باوجود مولانا خان

محمد صاحب نے کمال مہربانی سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا وقت نکالا۔ اثنائے گفتگو میں چائے بھی آ گئی۔ تقریباً نصف گھنٹے کی اس روحانی محفل سے لطف اندوز ہونے کے بعد پھر آغاز سفر کیا۔

طویل تھکا دینے والے سفر کے بعد ساڑھے تین بجے جہلم شہر کے قریب قصبہ مغل ٹھٹھیاں میں ابوظہبی کے رفیق مشتاق بیگ صاحب کے گھر پہنچے تو یہ جان کر شدید صدمہ ہوا کہ مشتاق بیگ صاحب ریلوے کلب گراؤنڈ کے قریب جلسہ کے سلسلہ میں بجلی کے کھمبے کے اوپر بینر لگاتے ہوئے بجلی کا جھٹکا لگنے سے شدید زخمی ہو گئے اور ہسپتال میں داخل ہیں۔ گجرات کے امیر جناب شمس الحق اعوان صاحب کی متحرک قیادت میں مشتاق بیگ صاحب، محمد اشرف فاروق صاحب اور دیگر نوجوان رفقاء نے جہلم کے جلسے کو کامیاب بنانے کے لئے جس جوش اور جذبے سے محنت کی وہ انہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی پر خلوص کوششوں میں برکت عطا فرمائے اور اپنی جناب میں شرف قبولیت سے سرفراز فرمائے۔

امیر محترم مشتاق بیگ صاحب کے گھر آرام کی غرض سے رک گئے۔ میاں محمد نعیم چودھری محمد اسحاق صاحب اور راقم اسی وقت بیگ صاحب کی تیمارداری کے لئے جہلم ہسپتال پہنچے۔ اس وقت وہ بستر پر نیم بے ہوشی کی حالت میں لیٹے ہوئے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہو کر ابوظہبی جا چکے ہیں۔ مغل ٹھٹھیاں میں بعد نماز عصر مشتاق بیگ صاحب کے چھوٹے بھائی کی تقریب نکاح اس حادثہ کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی۔ مگر چونکہ نماز عصر کے وقت قصبہ کے لوگ اور مہمان کافی تعداد میں موجود تھے اس لئے امیر محترم نے شادی بیاہ کے بارے میں اپنی اصلاحی تحریک کے حوالے سے سنت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر روشنی ڈالی۔ اس مختصر خطاب کو بہت پسند کیا گیا۔

امیر محترم، میاں محمد نعیم صاحب اور چودھری اسحاق صاحب بعد نماز مغرب مغل ٹھٹھیاں سے جہلم تشریف لے آئے اور سب سے پہلے مشتاق بیگ صاحب کی تیمارداری کے لئے ہسپتال گئے۔ امیر محترم نے معالجین سے مشتاق صاحب کی صحت کے بارے میں تبادلہ خیال بھی کیا۔ پھر ریلوے کلب گراؤنڈ کی قریبی مسجد میں نماز عشاء ادا کر کے جلسہ گاہ میں پہنچے۔ امیر محترم نے پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا کیوں اور کیسے؟ کے موضوع پر تقریباً دو گھنٹے خطاب فرمایا آخر میں سامعین کو دعوت دی گئی کہ جن حضرات کے ذہن میں کچھ سوالات ہوں وہ صبح بعد نماز فجر گراؤنڈ کے قریب جامعہ اثریہ اہل حدیث کی مسجد میں تشریف لائیں۔

بدھ ۱۵ اپریل کو بعد نماز فجر جامعہ اثریہ میں بعد نماز فجر سوال و جواب کی نشست منعقد ہوئی شرکاء کی زیادہ تعداد جامعہ اثریہ کے طلباء پر مشتمل تھی باہر سے بہت کم تعداد میں لوگ تشریف لائے تھے۔ امیر محترم نے لوگوں کے مختلف اشکالات کی وضاحت فرمائی اور سوالوں کے جواب دیئے۔

میرپور (آزاد کشمیر)

آزاد کشمیر سے تعلق رکھنے والے ہمارے بزرگ و دیرینہ رفیق جناب سید آزاد صاحب مع چند ساتھیوں کے رات کو ہی جہلم کے جلسہ میں پہنچ چکے تھے۔ صبح نو بجے جہلم سے ان کے ساتھ میرپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ میرپور میں ہمارے میزبان جناب ڈاکٹر اختر زمان غوری صاحب تھے۔ ساڑھے دس بجے ہم ان کے گھر پہنچ گئے۔ میرپور میں نماز عصر سے لے کر نماز عشاء تک تین مسلسل پروگرام طے تھے۔ نماز عصر کے بعد فیصل ہسپتال کے نزدیک جامع مسجد کے سبزہ زار میں شہر کے صاحبانِ علم و فضل اور دیگر معززین کے ہمراہ گفتگو اور تبادلہ خیال کی نشست تھی۔ تقریباً دو سو افراد کے اس اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا اس وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہر شعبۂ تعلیم سے تعلق رکھنے والے قابل نوجوان طالب علم عربی زبان اور دینی علوم سے واقفیت حاصل کریں اور پھر دورِ جدید کے باطل نظریات کا ابطال اور عہد جدید کے مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ جب تک یہ کام نہیں ہو گا اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں انجمن خدام القرآن کی کوششوں اور قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج کے منصوبوں کا تعارف کراتے ہوئے امیر محترم نے شرکاء سے اپیل کی کہ اپنی اولاد اور اپنے حلقہ اثر میں سے اہل اور لائق نوجوان طلبہ کو اس کام کے لئے تیار کریں۔ جو تعلیم قرآن کو اپنی زندگیوں کا محور و مقصد بنا لیں۔ نماز مغرب کے بعد جامع مسجد گلزار مدینہ میں ڈاکٹر اختر زمان غوری صاحب کے بھائی کی دو بیٹیوں کے نکاح کی تقریب منعقد ہوئی۔ امیر محترم نے خطبہ نکاح کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن حکیم رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے نئے جوڑے کو جو ہدایت راہنمائی فرماتا ہے اس کی بنیاد تقویٰ ہے۔ ہمارے معاشرہ میں شادی بیاہ کی جو ہندوانہ رسومات رائج ہیں وہ متوسط اور نچلے طبقے کے افراد کے لئے سوہان روح بن گئی ہیں۔ ان کے خاتمہ کے لئے ایک تحریک کی ضرورت ہے ہم سنتِ نبویؐ پر عمل پیرا ہو کر اپنے لئے اور دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ مسجد میں نکاح کی تقریب بھی نبی اکرم کی ایک سنت پر عمل ہے۔

اس تقریب میں میرپور شہر کے معززین 'حکام' جج اور وزیر حضرات بھی مہمانوں میں شامل تھے۔ سب نے اصلاح کے اس عملی طریقے کو بے حد پسند کیا۔ میزبان کی زبانی معلوم ہوا کہ میرپور کی تاریخ میں یہ پہلی تقریبِ نکاح ہے جو مسجد میں سنت نبویؐ کے مطابق منعقد ہوئی اور لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا اہتمام بھی نہیں کیا گیا۔

بعد نماز عشاء مولانا عبدالغفور صاحب کے دارالعلوم فرقانیہ کے سالانہ اجلاس کے آخری دن دارالعلوم کی مسجد میں امیر محترم نے پاکستان میں اسلامی انقلاب کیا کیوں اور کیسے موضوع پر خطاب

فرمایا۔ میرپور میں یہ امیر محترم کا تیسرا خطاب تھا۔ میرپور کے ان تینوں اجتماعات میں مکتبہ بھی لگایا گیا جہاں میری معاونت آزاد کشمیر کے رفقاء نے کی۔

جمعرات ۱۶ر اپریل کو بعد نماز فجر مسجد میں سوال جواب کی نشست منعقد ہوئی۔ تقریباً ۵۰ کے قریب افراد نے شرکت کی۔ اسی طرح میرپور کے اس آخری پروگرام کے ساتھ دورہ مکمل ہو گیا صبح نو بجے لاہور کے لئے روانہ ہو گئے۔ لاہور سے پشاور' پشاور سے بنوں ڈیرہ اسماعیل خان اور پھر جہلم و میرپور سے لے کر واپس لاہور آنے تک ہمارے ڈرائیور نور محمد نے جس محنت اور جانفشانی سے ہمارا ساتھ دیا اس نے سفر کی صعوبتوں کو بہت کم کر دیا۔

منہجِ انقلابِ نبویؐ

سیرت النبی ﷺ کی روشنی میں اسلامی انقلاب کی

جدوجہد کے رہنما خطوط

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لیکر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسکی بین الاقوامی توسیع تک

اسلامی انقلاب کے مراحل مدارج اور لوازم

پر مشتمل

ماہنامہ "میثاق" میں شائع شدہ

امیر تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے دس خطبات کا مجموعہ

قیمت : -/۲۰ روپے صفحات : ۳۷۵ (نیوز پرنٹ)

ملنے کا پتہ : مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۳۶ ماڈل ٹاؤن لاہور

خالص اجزا — بہتر شربت

جامِ شیریں

خالص، پُرتاثیر، فرحت بخش

قرشی کے مشروبات

جامِ شیریں، صندل، الائچی، بزوری اورنج ڈرنک

آپ کا نبض شناس

قرشی

THE ORIGINAL
Coca-Cola
Have a Coke and a smile.
"COCA-COLA" AND "COKE" ARE THE REGISTERED TRADE-MARKS WHICH IDENTIFY
THE SAME PRODUCT OF THE COCA-COLA COMPANY.

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی

رُوح افزا

تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔

فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔

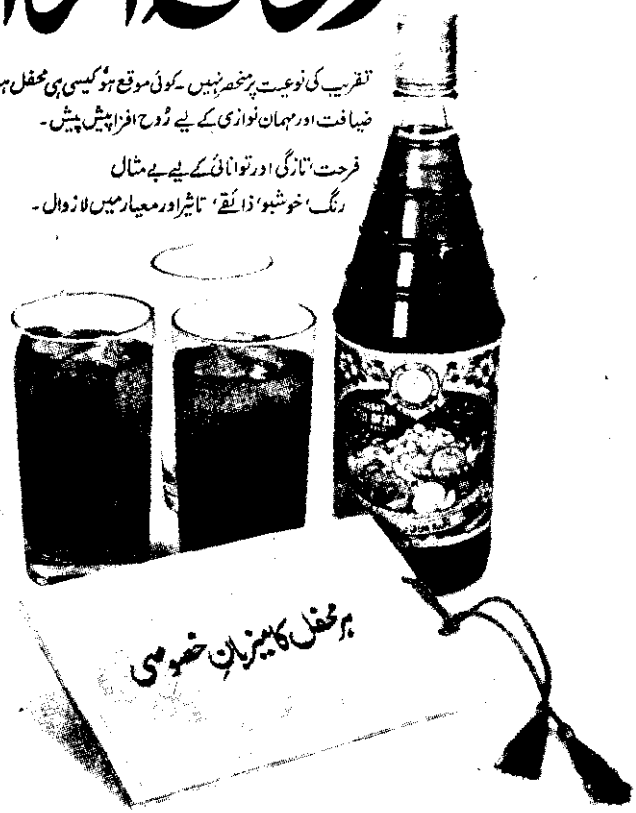

رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا

ہم خدمت خلق کرتے ہیں

خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

ADARTS

HMD-6 87

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ
عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا
مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا
وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝

ترجمہ

اے ہمارے رب! اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔ اور اے ہمارے رب! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں اور اے ہمارے رب! ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما!

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد بھگوان سٹریٹ، پرانی انارکلی ○ لاہور

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓی اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْکُمْ
عَذَابًا مِّنْ فَوْقِکُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ
اَرْجُلِکُمْ اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّ یُذِیْقَ
بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ اُنْظُرْ کَیْفَ
نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ ○

ترجمہ

اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ اللہ قادر ہے کہ تم پر تمہارے اوپر سے عذاب نازل کرے یا تمہارے قدموں تلے سے عذاب بھیج دے یا تمھیں گروہوں میں تقسیم کرکے آپس میں ٹکرا دے اور (اس طرح) تمھیں ایک دوسرے ہی کی جنگی قوت کا مزا چکھائے۔ دیکھئے کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تاکہ وہ سمجھ جائیں (الانعام ۶۵)

عطیہ اشتہار

جدید گھڑیوں کی فروخت اور
بہترین سروس کا مرکز

کیسیو ٹائم سنٹر
الکریم مارکیٹ
۱۲- نیو انارکلی —— لاہور

مقابل ہے آئینہ

کراچی کی آگ کو بھڑکانے میں کس کس کا — کتنا کتنا حصّہ ہے ؟

سقوطِ مشرقی پاکستان کے پندرہ برس بعد — سندھ کیوں جل رہا ہے ؟

پنجابی سندھی کشمکش — مہاجر پٹھان تصادم کیوں بن گئی ؟

کیا اِس شر میں کچھ خیر بھی ہے ؟

سیاسی محرومیوں، انتظامی بے تدبیریوں، حکمرانوں کے آمرانہ طرزِ عمل، اپنوں کی مہربانیوں اور غیروں کی سازشوں کا — بے لاگ تجزیہ

اصلاحِ احوال کی مثبت تجاویز

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کا تازہ سلسلہ مضامین

استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ

کتابی صورت میں دستیاب ہے

ہر دردمند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے

۱۴۴ صفحات، سفید آفسٹ کاغذ، قیمت صرف ۱۵/ روپے

ملنے کا پتہ : ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور- فون : ۸۵۲۶۸۳

سُہراب

MONTHLY
MEESAQ
LAHORE

Regd. L. No. 7360
Vol. 36 No. 6
JUNE 1987

For Quality Products

ASIA

BATHROOM ACCESSORIES

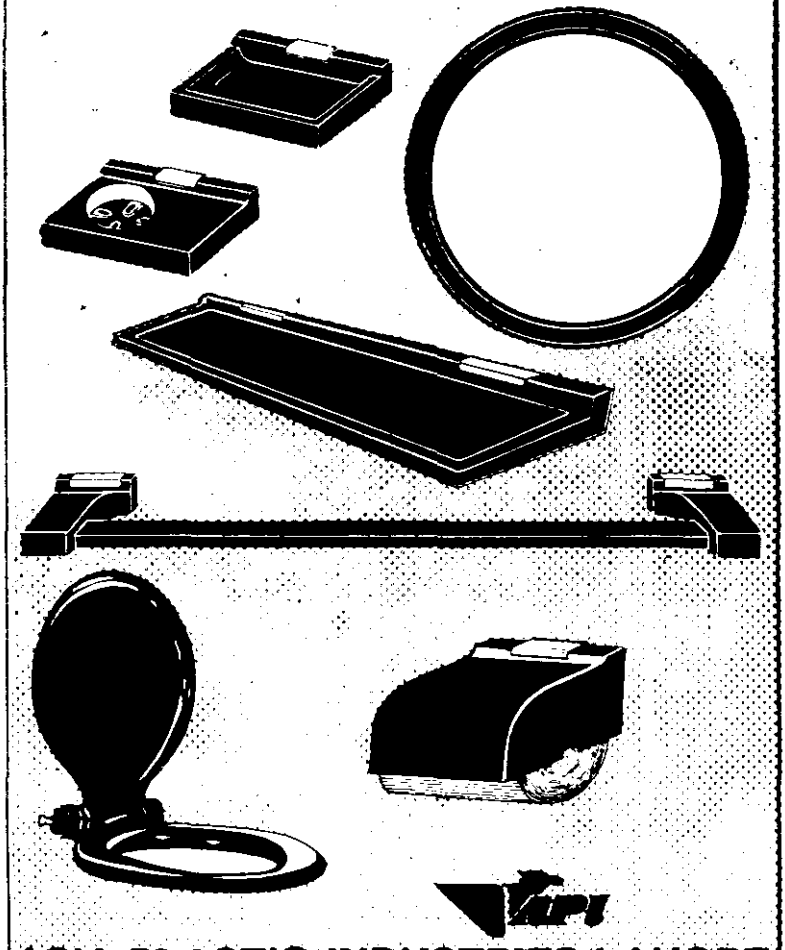

ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE